غالب شناس مالک رام

ڈاکٹر گیان چند

ادارۂ یادگار غالب کراچی

غالب شناس مالک رام

ڈاکٹر گیان چند

ادارۂ یادگارِ غالب
کراچی

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ یادگار غالب

شمار: ۳۵

طبع اول : ۲۰۰۲ء

طابع : احمد برادرز، ناظم آباد، کراچی

تعداد : پانچ سو

قیمت : ایک سو چالیس روپے

☆

ادارۂ یادگار غالب

پوسٹ بکس نمبر ۲۲۶۸

ناظم آباد۔ کراچی ۷۴۶۰۰

☆

غالب لائبریری

دوسری چورنگی۔ ناظم آباد نمبر ۲

کراچی ۷۴۶۰۰

فہرست

انتساب

آج کے سب سے بڑے ماہرِ غالبیات

کالی داس گپتا رضا

اور

نہایت دقیق و جامع تحقیق کے خُوگر

ڈاکٹر حنیف احمد نقوی

کے نام

اس کتابچے کی تصنیف میں جب بھی کسی الجھن سے دوچار ہوا، کالی داس گپتا کے پاس دوڑا ہوا گیا اور اپنی مشکل کا حل کرالیا۔

حنیف نقوی کو میں نے چھ سال پڑھایا ہے۔ اس کتابچے کی تیاری میں اس کے مجموعۂ مضامین "غالب، احوال و آثار" سے بہت کچھ اکتساب کیا، دیا اس کی "گرد و کشتا" ہے جس کا اسے علم نہیں۔

پیش لفظ

غالب اکیڈمی نئی دہلی نے طے کیا کہ ممتاز ماہرِ غالبیات مالک رام کے نام پر ہر سال کوئی خطبہ دلایا جائے۔ یہ مالک رام کے اختصاص کے کسی بھی موضوع پر ہو سکتا ہے لیکن پہلے سال کے لیے تجویز کی گئی کہ افتتاحی خطبہ خود مالک رام ہی پر ہو۔ معلوم نہیں کس طرح اس اعزاز کا قرعۂ فال مجھ دیوانے کے نام پر نکلا۔ چونکہ مجھے ان کی جناب میں ایک قربِ نیاز مندی رہا ہے، اس لیے میں اپنی بے بضاعتی کے باوجود انکار نہ کر سکا۔ بے بضاعتی اس معنی میں ہے کہ مالک رام کی تحقیق کا اہم حصہ غالبیات میں ہے۔ ان پر گفتگو کرنی ہو تو بات لامحالہ غالبیات تک پہنچے گی۔ غالب صدی کے طفیل میں میں نے غالب پر کچھ لکھا پڑھا، غالب کے کلام اور سوانح کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کیں، لیکن میں غالبیات کے غوامض کا عرفان نہیں رکھتا۔

میں نے جب مالک رام کی غالبیات کی تحریروں کا جائزہ لینا شروع کیا تو کئی جگہ الجھنوں سے دوچار ہوا۔ کتابیں پڑھیں، رسالوں کے مضامین دیکھے، لیکن اصل ذرائع میری دسترس میں نہ تھے اس لیے بعض گتھیاں نہ سلجھ سکیں۔ ریٹائر ہونے کے بعد میں لکھنؤ میں کتب خانوں سے دور ہو گیا ہوں۔ یہاں تحقیقی کتب کا کوئی اچھا کتب خانہ ہے بھی نہیں۔ میرے لیے سہل راستہ یہی تھا کہ کالی داس گپتا رضا سے استفسار کروں

مالک رام کے بعد نسل میں وہ چوٹی کے ماہرِ غالبیات ہیں۔ میں نے بار بار اُن سے مشورہ کیا اور مسلسل مراسلت کے ذریعے اپنے شکوک کا ازالہ کیا۔

میں نے مالک رام کے قلمی آثار کا تین بڑے زمروں میں جائزہ لیا ہے:

۱۔ طبع زاد کتابیں۔ ۲۔ مضامین کے مجموعے اور متفرق مضامین۔ ۳۔ غالبیات کی تدوین۔ ۱۹۷۸ء کی بات ہے کہ میں نے ایک طویل مضمون ''مالک رام بحیثیت ماہرِ غالبیات'' لکھا تھا۔ اس کے بعد غالبیات پر مالک رام کی کئی کتابیں آئیں۔ یہ لیکچر قلم بند کرتے وقت میں نے مندرجۂ بالا پہلے دو زمروں میں اپنے سابقہ مضمون سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا، از سرِ نو لکھا لیکن تدوین والے حصے میں خطوطِ غالب اور دیوانِ غالب مرتبۂ مالک رام کے بارے میں تقریباً سب کچھ اُسی مضمون سے لیا ہے، بقیہ پورا کتابچہ نئی تصنیف ہے۔ مجھے امید ہے کہ مالک رام نے غالبیات میں جو کچھ لکھا ہے، اس کی ہر فصل اور ہر عنوان کے بارے میں اس کتابچے میں کچھ نہ کچھ ملے گا۔ لیکچر ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو دیا گیا۔

۱۹۷۸ء کے مضمون کو لکھتے وقت میں نے مالک رام کی جملہ کتبِ غالبیات کو دیکھا تھا۔ اب دوبارہ دیکھنے کی ضرورت ہوئی۔ بہت کچھ تو میرے پاس تھیں، بقیہ کے لیے دوستوں کا منھ دیکھا۔ ان میں سے بعض مثلاً ''گلِ رعنا'' اور ''دستنبو'' کاظم علی خاں سے ملیں، چار کتابیں کالی داس گپتا کے بے نظیر ذخیرے سے بمبئی سے منگائیں، ان میں کم یاب ''سبد چین'' بھی تھی۔ ۱۹۷۸ء میں یہ سب کتابیں میرے مطالعے میں رہی تھیں۔ میں ان دونوں حضرات کا شکر گزار ہوں، خصوصاً کالی داس گپتا رضا کا جن سے اس موضوع کے بارے میں مسلسل تبادلۂ خیالات رہا۔ عزیزی ڈاکٹر حنیف احمد نقوی کے مجموعۂ مضامین ''غالب، احوال و آثار'' (لکھنؤ، ۱۹۹۰ء) سے بھی کافی استفادہ کیا۔

اس خطبے کے لیے غالب اکیڈمی کے جن اربابِ حل و عقد نے مجھے منتخب کیا، میں ان سب کا مشکور و ممنون ہوں۔ کہیں بہتر ہوتا کہ پہلے لیکچر کے لیے کسی ممتاز ماہرِ غالبیات کو دعوت دی جاتی۔ شاید میں سامعین و قارئین کی توقعات پوری نہ کر سکوں۔ مختصر مدت، مختصر صفحات اور مختصر علمیت کے ہوتے یہی کچھ ممکن تھا۔ آپ اسے عالمانہ

کارنامہ نہ سمجھیے، جو یہ ہرگز نہیں ہے، بلکہ اسے مالک رام کی خدمت میں ایک عاجزانہ خراجِ تحسین و ارادت سمجھ کر قبول کیجیے۔

لکھنؤ۔ ۱۷؍اپریل ۱۹۹۵ء گیان چند

پس نوشت:

مجھے بے حد خوشی ہے کہ پاکستان میں میری یہ کتاب ادارۂ یادگارِ غالب کی طرف سے شائع ہو رہی ہے۔ میں اس کے لیے ادارے کی صدر محترمہ بیگم مجیدہ ملک کا تہِ دل سے شکرگزار ہوں۔

گیان چند

۲۲؍ اکتوبر ۲۰۰۱ء

نیواڈا۔ اروائن

امریکہ

پہلا باب
تمہید

محترم بزرگ مالک رام سے میرے نیازمندانہ مراسم اواخرِ ۱۹۶۵ء میں شروع ہو کر اُن کے دمِ آخر تک رہے۔ اُن کے اور میرے بیچ پہلا رابطہ جس طرح کا تھا، اسے یاد کرتا ہوں تو آج بھی عرقِ ندامت سے شرابور ہو جاتا ہوں۔ ہوا یوں کہ مالک رام صاحب کا مرتبہ دیوانِ غالب، آزاد کتاب گھر دہلی سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔ اس میں غالب سے منسوب وہ غزل بھی شامل تھی جس کا مقطع ہے:

پیرانہ سال غالبِ مے کش کرے گا کیا
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

ان دنوں میں حمیدیہ کالج بھوپال میں ملازم تھا۔ وہاں مجھے اس غزل کے مصنفِ اصلی کا نام معلوم ہو گیا، ان سے ملاقات ہوئی اور وہ اسکول میگزین دیکھی جس میں یہ غزل "اپریل فول" کے عنوان سے چھپی تھی۔ وہاں سے یہ غزل "دین و دنیا" دہلی میں اور پھر "ہمایوں" لاہور، اپریل ۱۹۳۹ء میں نقل کی گئی۔ سب سے آخر میں یہ "دیوانِ غالب نسخۂ عرشی" میں شامل ہوئی، لیکن عرشی صاحب نے نوٹ لکھا کہ انھیں اسے کلامِ غالب ماننے میں بے حد تامل ہے (طبعِ اول ۱۹۵۸، ص ۳۹۱)۔ مالک رام صاحب نے اپنے مرتبہ دیوان میں ایسا کوئی نوٹ نہیں لگایا تھا۔ دلی یونیورسٹی کے رسالے "اردوئے معلّیٰ" غالب نمبر کے لیے مجھ سے ایک مضمون لکھنے کی فرمائش کی گئی۔ میں نے اسی غزل کے چہرے سے نقاب اُٹھایا۔ تصحیح میں کوئی ہرج نہیں، لیکن وہ تہذیب اور نرمی کے ساتھ کی جانی چاہیے۔ میری کم عمری اور کم عقلی کا زمانہ تھا (اب بھی کون سا عاقل ہوں) کسی نے مجھے چڑھا بھی دیا تھا، میں نے غزل کی حقیقت افشا کرنے میں

آداب کو ملحوظ نہیں رکھا اور چند طنزیہ جملے لکھ دیے۔

کہا جاتا ہے کہ علم میں بھی نشہ ہوتا ہے۔ جس کا علم کچا ہو، اُسے معلومات کا ایک پارہ مل جائے تو اس پر کچی شراب کا اثر ہوتا ہے۔ میں نے نوجوانوں کو دیکھا ہے کہ تحقیق و تنقید کی بحثوں میں فرقِ مراتب کو ملحوظ نہ رکھ کر جارحیت پر اتر آتے ہیں۔ اٹھتی جوانی بردباری اور خاکساری سے واقف نہیں ہوتی۔ یہ نمائی تو سال خوردگی کے بعد ہی نصیب ہوتی ہے۔ چوہے کو ہلدی کی گانٹھ مل جائے تو خود کو پنساری کہنے لگتا ہے۔ کہاں مالک رام جیسا نابغۂ غالبیات، کہاں میں ٹٹ پونجیا: چراغِ مردہ کجا، شمعِ آفتاب کجا۔ اس غزل پر گستاخانہ تحریر ہی پر کیا اشکِ ندامت ٹپکاؤں، میں تو پلٹ کر جب اپنی طویل عمرِ رفتہ پر نظر دوڑاتا ہوں تو یہ حماقتوں اور غلطیوں کی زنجیر دکھائی دیتی ہے جس کے ہر حلقے کو دیکھ کے میں منفعل ہوتا ہوں لیکن تیس چالیس سال کے جسم میں ۷۰ سالہ قلب و ذہن تو نہیں رکھا جاسکتا تھا۔

میرے پاس اس کچی تحریر کی کوئی نقل نہیں، صحیح زمانۂ تحریر یاد نہیں، میں نے اپنے مضامین کی فہرست میں اسے شامل نہیں کیا۔ مالک رام صاحب نے اس پر ''فکر و نظر'' میں ایک طویل جوابی مضمون لکھا تھا۔ انھوں نے عفوِ بزرگانہ سے کام لیتے ہوئے نہ اسے اپنے کسی مجموعے میں شامل کیا، نہ مضامین کی فہرست میں جگہ دی۔

۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنے دولت خانے پر مالک رام صاحب، جگن ناتھ آزاد صاحب اور مجھ غریب شہر کو مدعو کیا۔ مالک رام صاحب سے پہلی بار نیاز حاصل ہوا۔ میں محجوب تھا، لیکن مالک رام کی متانت کہ میری خانہ خراب تحریر کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ بجائے اس کے اپنی اور مختار الدین احمد کی مرتبہ ''کربل کتھا'' مجھے تفویض کی۔ ان کے دستخطوں پر ۵ دسمبر ۱۹۶۵ء کی تاریخ پڑی ہے، گویا اس دن میں نے پہلی بار اس عہد ساز شخصیت کو دیکھا۔ اس وقت انھوں نے عمرِ عزیز کے ۵۹ برس بھی پورے نہیں کیے تھے۔ اُس دن سے آخری دم تک وہ مجھ پر کمال مہربان رہے۔ میرے شاگرد بہت ہیں، رفیق اور دم ساز بھی کم نہیں، لیکن مہرپرور بزرگ خال خال ہیں۔ مالک رام کے چلے جانے سے ایسے شجرِ سایہ دار کے اکھڑنے کا غم ہوتا ہے جس کی

چھاؤں میں مجھے عافیت ملتی تھی۔ میں مارچ ۱۹۹۳ء کے تیسرے ہفتے میں دلی گیا تھا لیکن فاصلے کی وجہ سے ان سے نہ مل سکا، مصروفیت کی وجہ سے انھیں فون بھی نہ کر سکا۔ سوچا، اگلی دفعہ آؤں گا تو تلافی کر لوں گا۔ لیکن یہ کہاں معلوم تھا کہ وہ اگلے مہینے ہی بچھڑ جائیں گے۔ وہ کہاں گئے ہیں؟ ان سے آخری بار کیونکر ملوں؟ اقبال نے کہا تھا:

کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں
کہاں جاتا ہے، آتا ہے کہاں سے

میں بھی اس حقیقت سے ناآشنا ہونے پر اداس ہوں، سوچا کرتا ہوں۔ اقبال ہی کا ایک اور شعر ہے:

جو بادہ کش تھے پرانے، وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی

ہم دیکھ رہے ہیں کہ بیسویں صدی کے نصف اول نے ہمارے ملک میں جن عظما کو سرگرم کار کیا، نصف دوم نے اس قد و قامت کے انسان پیدا نہیں کیے۔ سیاسی قائدین میں مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، مولانا آزاد، راجیندر پرشاد، سردار پٹیل، راج گوپال آچاریہ، سبھاش چندر بوس، محمد علی جناح وغیرہ جیسے دیوقامت اس صدی کے نصفِ دوم میں نہیں ابھرے۔ ٹیگور اور اقبال جیسے شاعر، بوس اور رمن جیسے سائنس دان پیدا نہیں ہوئے۔ کیا یہ بونوں کا دور ہے؟

اردو میں اب سے پہلے کیسے کیسے عظما ہو چکے ہیں۔ مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی رشید احمد صدیقی، مسعود حسن رضوی، قاضی عبدالودود، مولانا عرشی، مالک رام ڈاکٹر زور وغیرہ۔ ان سب کی علمی و ادبی شخصیت قلۂ کوہسار کی طرح رفیع و عظیم تھی اب لے دے کے پروفیسر سرور کی ذاتِ گرامی دکھائی دیتی ہے۔ یہ بات نہیں کہ دوسرے محقق و نقاد معتبر نہیں، وہ ضرور ہیں۔ ان میں سے کئی کے علم و فضل کی قسم کھائی جا سکتی ہے، لیکن معلوم نہیں کیوں، کسی میں عظمت کا وہ ہالہ دکھائی نہیں دیتا جو اگلے کے علما میں تھا۔ شاید مرورِ ایام کے ساتھ ان میں سے بھی شعاعیں پھوٹنے لگیں۔

مالک رام نابغۂ غالبیات ہی نہ تھے، وہ ماہرِ ابوالکلامیات اور ماہرِ اسلامیات بھی تھے۔ اسلامی علوم میں ان کی نظر کی داد مولانا عبدالماجد دریا بادی دے چکے ہیں۔ مالک رام عجم و عرب کی قدیم تاریخ کا بڑا عرفان رکھتے تھے۔ ان کی ضیائے تحقیق نے ان کی خاکہ نگاری کو دھندلا دیا ہے، حالانکہ "وہ صورتیں الٰہی" کے خاکے قدرِ اوّل کی چیز ہیں۔

رسالہ "آج کل" نے اگست ۱۹۶۷ء میں اردو تحقیق نمبر شائع کیا تو سرورق کے اندر اردو کے چار زندہ محققوں کی تصویریں اس عنوان سے چھاپیں: "اردو تحقیق کے چار ستون" ۔ یہ تصویریں قاضی عبدالودود، مولانا عرشی، مسعود حسن رضوی اور مالک رام کی تھیں۔ ان کے انتقال کے ساتھ قصرِ تحقیق کا آخری سال خوردہ ستون بھی ڈھے گیا۔

اتفاق یہ ہے کہ ان چاروں میں صرف جناب مالک رام کو منظم طریقے پر ہدفِ تنقیص بنایا گیا ہے۔ تحقیق میں فروگزاشتوں کی نشان دہی کی جائے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ شکایت کا مقام جب ہے جب اعتراض کا لہجہ علمی سطح سے گر جائے، جب صاف معلوم ہو کہ معترض کو کوئی ذاتی کد ہے، وہ اشاعتِ علم کی خاطر نہیں بلکہ کسی غیر علمی جذبے کے تحت خردہ گیری کر رہا ہے اور جب موقع پاتا ہے تو تبصرے میں ذاتیات کو لے آتا ہے۔ تنقید و تحقیق اگر معترضانہ بھی ہو تو بھی انصاف کا پلہ برابر رکھنا چاہیے، تصویر کے دونوں رُخ پیش کرنے چاہییں۔ کسی کتاب پر تبصرہ کرنا ہے تو اس کے حسن و قبح دونوں کو یوں ابھاریے کہ قاری کتاب کے بارے میں ایک متوازن رائے قائم کر سکے۔ مس میو کی انگریزی کتاب "مدر انڈیا" کے مرقعے حقیقت پر مبنی تھے، لیکن مہاتما گاندھی نے اس کتاب کو "گندی نالی کے انسپکٹر کی رپورٹ" قرار دیا تھا۔ اسی قسم کی ایک رپورٹ "اردو تحقیق اور مالک رام" نام کی کتاب ہے۔ اس کے مرتب کا نام "شاہد عظمی ایم اے" لکھا ہے، لیکن اس نام کا کوئی شخص نہیں۔ اس کا ناشر "ادارۂ تحقیق، دہلی نمبر۶" ہے اور یہ ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی۔ پتا ناکافی ہے۔ ہمیں اس نام کے کسی ادارے کا نام معلوم نہیں۔ جب یہ بات پھیل گئی کہ اس کا مصنف موہوم ہے تو اس کے اصل مرتبین نے کتاب کو بازار سے اٹھا لیا۔ تحقیق کے معنی حقیقت دریافت کرنے کے ہیں۔ جس کام کی بنیاد ہی جعل پر ہو، وہ راستی و صداقت و

حقیقت کی بات کرے تو انگریز کی کہاوت یاد آتی ہے کہ ابلیس صحیفوں کا حوالہ دے رہا ہے۔ کتاب کے نام سے ایسا لگتا ہے کہ اردو تحقیق میں مالک رام کی خدمات اجاگر کی ہوں گی، نیز ان کے تسامحات کی نشان دہی بھی کی ہوگی، لیکن کتاب میں دوسرا رخ ہی ہے۔ جس طرح کردار کشی ایک اصطلاح ہے، اسی طرح یہ کتاب مالک رام کی علمی شخصیت کشی کی کوشش کے سوا کچھ نہیں۔ اس کے پیش لفظ اور بعض مضامین کے انداز گفتار کے پیچھے معاندانہ جذبہ پھوٹ کر رس رہا ہے۔ اس کے غیر علمی لہجے سے قطع نظر، اس کے بعض مضامین کی اہمیت کا میں منکر نہیں۔

یہ مطالبہ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ تحقیق و تبصرے کو "گندی نالی کے انسپکٹر کی رپورٹ" نہ بنایا جائے۔ اگر صرف تسامحات شماری تک محدود رہنا ہے تو تبصرے کی ابتدا میں صراحت کر دی جائے کہ اس تحریر کو اغلاط و اسقام کی نشان دہی تک محدود رکھا گیا ہے۔

بزرگ نسل کے ماہرین غالبیات میں ذیل کے علما کو شمار کیا جاتا ہے:

مولانا غلام رسول مہر (۱۸۹۵ء تا ۱۹۷۱ء)، قاضی عبدالودود (۱۸۹۶ء تا ۱۹۸۴ء) مولانا امتیاز علی خان عرشی (۱۹۰۴ء تا ۱۹۸۱ء)، مالک رام (۱۹۰۶ تا ۱۹۹۳ء)، شیخ محمد اکرام (۱۹۰۸ء تا ۱۹۷۳ء)۔

ان عناصر خمسہ میں بھی مالک رام آخری تھے۔ انھوں نے غالبیات کے علاوہ دوسرے موضوعات میں بھی داد تحقیق دی، لیکن آج کی بات چیت ان کی غالبیات تک محدود رہے گی۔ دقت یہ ہے کہ میں کسی حد تک مالک شناس تو ہوں، غالب شناس نہیں۔ اس موضوع پر بات کرنے والا خود بھی ماہر غالبیات ہونا چاہیے کیوں کہ ولی را ولی می شناسد۔ غالب شناسی میں میری محض ایک کتاب ان کے منسوخ کلام کی شرح ہے۔ میں غالب پر مالک رام کے کاموں کا جائزہ لیتا ہوں تو بارہا کسی گلی، کسی بھول بھلیاں میں بھٹک جاتا ہوں کتابیں چھانتا ہوں اور بالآخر کالی داس گپتا رضا سے رہبری چاہتا ہوں۔ بہر حال اٹکتے، ٹھٹکتے مالک رام جیسے جید ماہر غالبیات کے کارناموں کو اپنی کم نظری کے باوصف آنکتا ہوں۔ غالب نگاری میں ان کے کاموں کا تین بڑے زمروں میں احصاء کیا جاسکتا

ہے۔

(الف) طبع زاد کتابیں:

۱۔ ذکرِ غالب ۲۔ انگریزی کتابچہ مرزا غالب ۳۔ تلامذۂ غالب

(ب) مضامین:

۴۔ فسانۂ غالب ۵۔ گفتارِ غالب ۶۔ تحقیقی مضامین میں غالبیات کے مضامین ۷۔ مجموعوں کے باہر متفرق مضامین ۸۔ مقدمات ۹۔ انگریزی مضامین

(ج) تدوین و ادارت:

(۱) فارسی: ۱۰۔ سبد چین ۱۱۔ دستنبو ۱۲۔ کلیاتِ نظم غیر مطبوعہ

(۲) اردو فارسی مشترک: ۱۳۔ گلِ رعنا

(۳) اردو: ۱۴۔ دیوانِ غالب ۱۵۔ خطوطِ غالب ۱۶۔ عیارِ غالب ۱۷۔ یادگارِ غالب

مالک رام نے اپنا پہلا مضمون "نیرنگِ خیال" لاہور کے ۱۹۲۲ء کے کسی شمارے میں شائع کرایا، لیکن یہ غالب سے متعلق نہ تھا۔ غالبیات میں ان کا پہلا مضمون "غالب اور ذوق" "نگار" ستمبر ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ غالبیات کے اِس ماہر کی غالب سے متعلق پہلی تحریر غالب کے خلاف تھی۔ انھوں نے زبان و طرزِ بیان کے اعتبار سے ذوق کو غالب پر ترجیح دی۔ جب سے آج تک مالک رام نے غالب کی نظم و نثر، اردو و فارسی، سوانح و شخصیت، سب پر تحریروں کا انبار لگا دیا ہے کم ماہرینِ غالبیات نے غالب پر اتنا زیادہ اور اس تنوع کے ساتھ لکھا ہوگا۔

ان کی کتابوں پر اظہارِ خیال کرنے سے قبل ایک شکوہ:

مالک رام صاحب کی کتابوں میں، وہ تصنیف ہوں کہ تدوین، فہرستِ مطالب سب سے پہلے نہیں ہوتی بلکہ عام قاعدے کے برخلاف ان کے دیباچے کے بعد ہوتی ہے۔کسی مضمون کو فہرست میں تلاش کرنا ہو تو پہلے ان کے دیباچے کے صفحات الٹیے جب فہرست برآمد ہوگی۔ مجھے اس سے بڑی دقت اور اسی تناسب سے جھنجھلاہٹ ہوتی ہے "گفتارِ غالب" کی "پیش گفتار" ۱۴ صفحوں کی ہے ص ۷ تا ۲۰۔ اس کے بعد ایک صفحے

پر فہرست ہے اور پھر متن کا پہلا مضمون۔ بسا اوقات فہرست تلاش کرتے وقت میں پیش گفتار، کے بعد متن کے مضمون تک پہنچ جاتا ہوں اور فہرست کا ورق بیچ میں چھپا رہ جاتا ہے، پھر ورق گردانی کرتا ہوں۔ ان سے متعلق دوسروں کے دو مجموعوں "ارمغانِ مالک رام" اور علی جواد زیدی کی "مالک رام، ایک مطالعہ" میں بھی یہی بدعت ہے، کیوں کہ ان کی کتاب بندی مالک رام صاحب کی زیر نگرانی ہوئی ہوگی۔ شکر ہے کہ کرنل زیدی کی "مالک نامہ" (۱۹۸۷ء) میں فہرست پہلے ہے اور پیش لفظ بعد میں۔ آئندہ اوراق میں غالبیاتِ مالک رام کا جائزہ لیا جائے گا۔

دوسرا باب

طبع زاد کتابیں

غالبیات کے میدان میں مالک رام نے صرف تین مستقل طبع زاد کتابیں تصنیف کیں، دو اردو میں اور ایک انگریزی میں، یہ ہیں،

ذکرِ غالب۔ مرزا غالب (انگریزی)۔ تلامذۂ غالب۔

ذیل میں ان کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

ذکرِ غالب

غالبیات میں یہ ان کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔ طبع پنجم کی عرضِ مؤلف میں انھوں نے اس کی شانِ نزول بیان کی ہے۔ ۳۸۔۱۹۳۷ء میں انھوں نے "سبد چین" اشاعت کے لیے تیار کی۔ ایک دن حامد علی خان جنرل مینیجر مکتبۂ جامعہ نے کہا کہ کتاب بہت پتلی ہے۔ آپ اس پر مبسوط دیباچہ لکھ دیجیے۔ مالک رام دن بھر اپنے دفتر میں کام کرتے، رات کے کھانے کے بعد دیباچہ لکھتے۔ اگلی صبح دفتر جانے سے پہلے حامد علی خان بلاناغہ آتے اور مسودے کی قسط لے جاتے۔ آخری قسط لے جانے کے بعد ایک دن کہنے لگے کہ اب یہی طے کیا ہے کہ آپ کا دیباچہ "سبد چین" سے الگ مستقل کتاب کی شکل میں چھاپ دیا جائے۔ اس پر مالک رام نے کہا کہ مسودہ واپس دے دیجیے تاکہ میں اس پر نظرِثانی کر دوں۔ حامد علی خان نے بتایا کہ اس کی تو کتابت بھی ہو چکی ہے اور پورا مضمون ۱۰۲ صفحوں میں آیا ہے۔

اس طرح کتاب کا پہلا ایڈیشن اوائلِ اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ یہ مصنف کا وہ پارہ پارہ مسودہ ہے جس کی وہ ترتیب وتہذیب نہ کرسکے۔ یہ کام بعد کی اشاعتوں میں ہوا۔ طبع اوّل کے ۲۰۱ صفحوں کے مقابلے میں طبع پنجم (فروری ۱۹۷۶ء) میں ۴۷۹ صفحات ہیں۔ علی جواد زیدی کے مجموعے "مالک رام، ایک مطالعہ" (جولائی ۱۹۸۶ء) میں توقیتِ مالک رام کی مرتب حبیبہ بانو نے مژدہ دیا ہے کہ "ذکرِ غالب" کا چھٹا ایڈیشن زیرِ طبع ہے (مطالعہ ص ۳۲۷)۔ یہ ایڈیشن آج تک نہیں آیا۔ ۱۹۷۶ء کا ایڈیشن ہی آخری اشاعت ہے۔

اس سے پہلے غالب کی تین مشہور سوانح عمریاں آچکی تھیں: حالی کی "یادگارِ غالب" ۱۸۹۷ء، غلام رسول مہر کی "غالب" ۱۹۳۶ء اور شیخ محمد اکرام کی "غالب نامہ" یا "آثارِ غالب" ۱۹۳۶ء۔ چوں کہ نقشِ ثانی نقشِ اول سے اور نقشِ ثالث نقشِ ثانی سے بہتر ہوتا ہے، اس لیے مالک رام کی "ذکرِ غالب" پیش رو سوانح عمریوں سے زیادہ مکمل ہے۔ اس کا پانچواں ایڈیشن اتنا پختہ اور باترتیب ہے جیسے ایک مربوط نظم یا گٹھے ہوئے ناول کا ایک حصہ دوسرے سے جڑا ہوا ہو۔ یہ بڑی حد تک مستند ہے۔ اوسط ضخامت کی اس کتاب میں سوانحِ غالب کی تمام معلومات اس طرح قابلِ اعتماد اور منضبط طریقے پر آگئی ہیں کہ اسے یونیورسٹیوں کے تحقیقی وتنقیدی مقالے کا ایک مثالی نمونہ کہا جاسکتا ہے۔

اس کتاب میں تین باب ہیں جنھیں تین حصے کہنا چاہیے۔ پہلے طویل باب میں غالب کے تحقیق شدہ حالات ہیں۔ دوسرے باب میں غالب کی تمام فارسی اور اردو تصانیف کی مستند تفصیلات ہیں۔ تیسرے باب کا عنوان "عادات واخلاق" ہے۔ یہ بھی بہت مفصل اور جامع ہے۔ اس کا بہتر عنوان "شخصیت" ہوسکتا تھا۔ کتاب میں غالب کے کلام پر تنقید کی کوشش نہیں کی گئی اور یہ اچھا کیا کہ سوانح کو محض ادیب اور اس کی شخصیت تک محدود رکھا۔

"ذکرِ غالب" کے دوسرے ایڈیشن پر قاضی عبدالودود نے "معاصر" حصہ ۲ میں

تبصرہ کیا۔ مجھے "معاصر" کا یہ شمارہ میسّر نہیں ہے۔ لیکن یہ تبصرہ "اردو تحقیق اور مالک رام" میں شامل ہے اور میرے سامنے یہی ہے۔ اس میں قاضی صاحب نے "ذکرِ غالب" کی بعض فروگزاشتوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کی کسی خوبی کے بارے میں ایک لفظ کے بھی گناہ گار نہیں۔ اعتراضات بہت سے ہیں، اہم اور غیر اہم، سنجیدہ اور غیر سنجیدہ ان میں سے بعض کو مالک رام نے قبول کر کے بعد کے ایڈیشنوں میں ترامیم کر لیں۔ میں چند کا ذکر کرتا ہوں۔

۱۔ مصنف نے غالب کی ولادت کا ذکر یوں کیا ہے:

"مرزا غالب ۸ رجب ــــ کو پیدا ہوئے۔ ۸ رجب کو مرزا غالب نہیں ایک بچہ عزت النسا بیگم کے بطن سے پیدا ہوا تھا جو تخلص ساتھ لے کر دنیا میں نہیں آیا تھا"۔

قاضی صاحب کا یہ اعتراض سخت گیری اور اعتراض برائے اعتراض کی ایک انتہائی مثال ہے۔ اگر تحقیق کو قانونی و سائنسی صحت ہی عطا کرنی ہے تو کسی تحریر میں "والد" کا لفظ استعمال نہ کیا جائے بلکہ والدہ کا شوہر کہنے پر اکتفا کی جائے، کیونکہ کس نے تحقیق کی ہے کہ مبینہ اولاد مبینہ والد ہی کے نطفے سے ہے۔ اب قاضی صاحب کے ایک مضمون سے صرف دو مثالیں ملاحظہ ہوں تاکہ ہم کہہ سکیں:

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

(الف) مرزا احمد غشا داماد انشا ۱۲۱۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔
(تحقیق نامہ، معاصر، جلد ۲، شمارہ ۸، ص ۱۰۳)

ظاہر ہے کہ پیدائش کے وقت نہ ان کا نام مرزا احمد تھا، نہ تخلص غشا، نہ وہ انشا کے داماد تھے۔ پس قاضی صاحب کو لکھنا چاہیے تھا:

مرزا احمد کی والدہ کے ہاں ۱۲۱۰ھ کے لگ بھگ ایک لڑکا پیدا ہوا ہوگا جس کا نام مرزا احمد رکھا گیا، بڑا ہونے پر وہ انشا کا داماد بنا اور اس نے اپنا تخلص غشا رکھا۔

(ب) سید محمد محزوں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ (ایضاً)

یہاں بھی وہی اعتراض وارد ہوتا ہے کہ سید محمد والدہ کے بطن سے نام اور تخلص لے کر برآمد نہیں ہوئے تھے۔ افسوس یہ ہے کہ "ذکرِ غالب" کا مصنف اس غیر سنجیدہ اعتراض سے خائف ہو گیا۔ پانچویں ایڈیشن میں لکھا ہے:

"مرزا ۸ رجب ۱۲۱۲ھ (۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء) کو بدھ کے دن سورج نکلنے سے چار گھڑی پہلے آگرے میں پیدا ہوئے"۔ (ص ۲۶)

ڈر ہو گا کہ مرزا اسد اللہ خاں لکھیں گے تو قاضی صاحب پھر گرفت کریں گے کہ بچہ ماں کے پیٹ سے اسد اللہ خاں نام لے کر پیدا نہیں ہوا تھا، حالانکہ اوپر کی مثالوں میں خود فاضل معترض نے دوسروں کو نام، تخلص اور نسبتی رشتے کے ساتھ پیدا ہونے دیا ہے۔

۲۔ عادات و اخلاق کا ایک خاص باب قائم کیا ہے، یہ بھی عہدِ حاضر کی روش کے خلاف ہے۔ واقعاتِ زندگی اس طرح بیان کرنے چاہییں کہ عادات و اخلاق کا الگ سے ذکر کرنے کی ضرورت نہ رہے۔

میرا خیال ہے کہ انگریزی میں جو بھی روش ہو، اردو میں شخصیت کا الگ سے ذکر کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔

۳۔ مصنف نے حوالے نہیں دیے ہیں۔

مجھے یہ تسلیم کہ مالک رام اول اول اپنی کتابوں میں ماخذ کا حوالہ درج کرنے کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ قاضی عبدالودود اور رشید حسن خان کی تنبیہوں کے بعد انھوں نے اظہارِ ماخذ کا طریقہ اختیار کیا۔ قاضی صاحب نے جن بیانات کا حوالہ طلب کیا ہے، لگتا ہے قاضی صاحب کو ان کی صحت میں شبہہ ہے۔ میں ذیل میں اہم تر اعتراضات نقل کرتا ہوں۔ ان کے ساتھ صفحے کا حوالہ "اردو تحقیق اور مالک رام" کا ہے جس کے نیچے میں اپنی وضاحت درج کروں گا اور اس کے لیے "ذکرِ غالب" طبعِ پنجم کا صفحہ نمبر لکھوں گا۔

الف۔ غالب لکھنؤ میں تھے کہ ایک مشاعرہ بڑے پیمانے پر ہوا جس میں غالب نے ایک غزل پڑھی جس کا مطلع ہے وہاں پہنچ کر جو غش آتا پے ہم ہے ہم کو (اردو

تحقیق، ص ۱۶)۔ مالک رام نے طبعِ پنجم، ص ۵۹ میں مشاعرے کی بات حذف کر کے صرف یہ لکھا کہ یہ غزل قیامِ لکھنؤ کی یادگار ہے۔

و۔ غالب میاں کالے صاحب کے مرید تھے (ص ۱۶)۔ اس کی وضاحت آگے "ذکرِ غالب"، ص ۲۲۹ کے سلسلے میں ملاحظہ کیجیے۔

ہ۔ یہ اطلاع کہ غالب نے ظفر کا سکہ کہا تھا، انگریزوں کو گوری شنکر جاسوس سے ملی تھی (ص ۱۶)۔ طبعِ پنجم میں حوالہ ہے: فاران (مستقرق) فروری ۱۸۷۷ء (۳۰-۳۳) (طبعِ پنجم ص ۱۱۰)۔

ز۔ معلوم ہوتا ہے کہ مشتری اور ــــ زہرہ ــــ نے بھی اس معرکے میں حصہ لیا تھا ــــ بعض ــــ کا خیال ہے کہ شمس نے خود اعتراض لکھ کر ان دونوں کے نام سے شائع کیے تھے (ص ۱۷)۔ بعد کے ایڈیشن میں مالک رام نے اس کا ماخذ "میخانۂ جاوید" جلد پنجم، ص ۳۶ درج کر دیا ہے (ذکرِ پنجم، ص ۱۸۰)۔

ح۔ عبدالصمد قبولِ اسلام سے پہلے زردشتی مذہب کے موبد تھے ــــ موبد ہونا مصنف کے سوا کسی نے نہیں لکھا (ص ۱۷)۔

اعتراض قبول کر کے مالک رام نے یہ جملہ یوں بدل دیا: "اسلام قبول کرنے سے پہلے وہ زردشتی مذہب کے پیرو تھے"۔ (ذکرِ پنجم، ص ۳۴-۳۵)

ک۔ غالب کا مقدمۂ قمار بازی کنور وزیر علی خاں کی عدالت میں پیش ہوا تھا (ص ۱۷)۔ بعد میں اس کا ماخذ "لال قلعے کی ایک جھلک" از ناصر نذیر فراق، ص ۳۳ درج کر دیا گیا (ذکرِ پنجم، ص ۹۱)۔

ل۔ یہ تجویز کہ غالب وائسرائے کے درباری شاعر مقرر کیے جائیں (ص ۱۷)۔

لکھتے ہیں:

"چیف سکتر گورنمنٹ پنجاب نے لکھا کہ میرے خیال میں کمشنر دہلی کی یہ سفارش معقول ہے کہ علیا حضرت ملکۂ معظمہ کا تو نہیں، لیکن انھیں وائسرائے کا درباری شاعر مقرر کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔ فاران ستمبر ۱۸۶۵ء

(۳، ۵، ۷)، نیز فاران عموی فروری ۱۹۶۹ء (۳۰ - ۳۳)۔ (ذکرِ غالب پنجم ص ۱۳۳)

۳۔

" اہلِ تشیع کی اس تحریک کے باوجود کہ غالب کی تجہیز و تکفین ان کے مذہب کے مطابق ہو ـــ نواب ضیاء الدین احمد خان ـــ اور حکیم محمود خان نہ مانے "۔

یہ واقعہ حالی نے لکھا ہے، مگر ان کے بیان میں کہیں حکیم محمود خان کا نام نہیں آیا (ص ۱۷)۔

مالک رام نے طبعِ پنجم میں بھی محمود خان کا نام لکھا ہے لیکن کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اس سے پہلے غالب کی وفات سے پہلے دن حکیم محمود خان سے مشورے کا ذکر ہے جس کا ماخذ لکھا ہے " بروایت بگا بیگم "۔ ظاہراً تدفین کے سلسلے میں ان کے بیان کا ماخذ بھی بگا بیگم کی روایت ہے۔ (پنجم، ص ۱۳۳)

۴۔ " ولی عہدِ دہلی نے غالب کا چار سو روپیہ سالانہ مقرر کر دیا۔ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا "۔ مالک رام نے اس کی صحت پر اصرار کر کے اس بیان کا ماخذ " اردوئے معلیٰ "، ۱۰۵ (بنام عبدالغفور سرور) درج کیا۔ (ذکرِ غالب، طبعِ پنجم، ص ۹۹)

۵۔ غدر میں کرنیل براؤن کے سامنے پیش ہونے کا ذکر ہے۔ ان کا صحیح نام کرنیل برن تھا (ص ۳۳)۔ واضح ہو کہ خود غالب نے " دستنبو " میں ان کا نام کرنیل بروَن لکھا ہے (مالک رام ایڈیشن، ص ۲۵)، حالی نے بھی " یادگارِ غالب " میں یہی نام درج کیا ہے (طبعِ اول، ص ۳۹)۔ مالک رام نے بعد کے ایڈیشنوں میں تصحیح کر کے کرنیل برن کر دیا۔ (ذکرِ غالب، پنجم، ص ۱۰۳)

۶۔ دیوانِ فارسی کا نام " مے خانۂ آرزو " لکھا ہے۔ صحیح نام " مے خانۂ آرزو سرانجام " ہے۔ (ص ۳۳)

اسے بھی مالک رام نے تسلیم کر لیا۔

۷۔ " ہندوستان کے فارسی لکھنے والوں میں بعض نام نہایت مشہور ہیں ـــ خسرو فیضی ـــ بیدل ـــ احسان اللہ ممتاز، قاضی محمد صادق خان اختر ان میں سے

صفِ اوّل کے لوگوں میں ہیں "۔ ممتاز اور اختر کا نام خسرو وغیرہ کے ساتھ لینا بڑا ادبی گناہ ہے (ص ۲۵)۔

اعتراض کو تسلیم کر کے مالک رام نے بعد کے ایڈیشنوں میں خسرو، فیضی، بیدل اور ناصر علی کو صفِ اوّل میں رکھا۔ ان کے بعد چند اشخاص کے لیے لکھا کہ اگرچہ ان کے پایے کے نہیں، پھر بھی ہندوستانی فارسی نویسوں میں بہت مشہور ہیں۔ ان اشخاص میں احسان اللہ ممتاز کا نام شامل کیا، صادق اختر کا نام سرے سے خارج ہی کر دیا۔

نفس بلرزہ ز باوِ نہیبِ کلکتہ

نگاہ خیرہ ز ہنگامۂ الہ آباد

غالب کے اس شعر کی بنا پر لکھا ہے کہ سفرِ کلکتہ میں غالب کے خلاف ایک ہنگامہ کلکتہ (کذا، صحیح الہ آباد) میں بھی ہوا تھا۔ مجھے شبہہ ہے کہ اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح غلام امام شہید سے تھا۔

قاضی صاحب کی رائے میں غالب کی شہید سے کوئی نزاع نہیں ہوئی۔ مالک رام نے بعد کے ایڈیشنوں میں سے شہید کا نام حذف کر دیا۔

غرض یہ ہے کہ قاضی صاحب کے بعض اعتراضات واقعی سہوِ مصنف کی تصحیح کرتے ہیں، لیکن بہت سے اعتراضات فروعی ہیں۔ یہ اتنے اہم نہیں جتنے مالک رام صاحب کے متعدد انکشافات اور اضافے۔ کاش تبصرہ نگار کو ان کے بارے میں ایک حرفِ خیر کہنے کی بھی توفیق ہوئی ہوتی! اب میں اس کے چند مندرجات پر اپنے مشاہدات پیش کرتا ہوں۔ صفحوں کا نمبر طبعِ پنجم کے مطابق ہے۔

پہلی عموی بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ مالک رام نے متعدد موقعوں پر حاشیے میں پُر مغز معلومات درج کی ہیں۔ انھیں متن میں کیوں نہیں لکھا، یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے اپنی کتاب " تحقیق کا فن" میں مفصل لکھا ہے کہ حتی الامکان حاشیے کا استعمال ماخذ کے حوالے کے لیے کیا جائے۔ مفید تبصراتی معلومات کو متن ہی میں دینا چاہیے۔ صرف ایسا تبصرہ حاشیے میں دے سکتے ہیں جو متن میں دیا جائے تو دخل در معقولات معلوم ہو (تحقیق کا فن، ص ۲۲ - ۳۲۳)۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ " ذکرِ غالب"

میں متن اور حاشیے کے مطالب کے تعین میں بالکل بزاج کا عالم ہے۔ ایک موضوع کی پُرمغز بحث کا ایک حصہ متن میں دیا اور اس سے متعلق اتنی ہی پُرمغز معلومات حاشیے میں پھینک دی، مثلاً دیکھیے سفرِ کلکتہ کے حواشی۔

ابتدائی پانچ صفحوں ۱۷۔ ۲۱ میں قدیم ایرانی خاندانوں کی تاریخ کا نچوڑ بڑی صراحت کے ساتھ درج کیا ہے۔ قاضی عبدالودود نے طبع دوم کی تفصیلات سے اختلاف کیا تھا۔ بعد کے ایڈیشنوں میں مالک رام نے ان کے بعض اختلافات کو قبول کیا، دوسروں کو نہیں۔ دراصل قدیم ایران کی تاریخ اساطیری زیادہ ہے، موجودہ معنی میں تاریخی کم، اس لیے مختلف راویوں کے یہاں مختلف بیانات ملتے ہیں۔ قاضی صاحب جن راویوں سے متفق تھیں، ضروری نہیں کہ مصنفِ "ذکرِ غالب" بھی ایسا ہی کرے۔

ص ۲۴۔ ملا عبدالصمد کے وجود کے بارے میں ایک اور شہادت لائے ہیں جو مفسانۂ غالب" کے مضمون " عبدالصمد استاد غالب" میں نہیں۔ یہ مضمون " نوائے ادب" جنوری ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا۔ " ذکرِ غالب " طبعِ پنجم میں نواب علائی کا ایک قول درج کرتے ہیں:

" عبدالصمد تاجر تھا۔ ذخائر کے لیے آگرے کو اس نے امید گاہ بنایا تھا"
(" نگار، رام پور، فروری ۱۹۴۳ء)۔

ص ۳۶۔ مالک رام غالب پرست نہیں۔ صاف لکھتے ہیں کہ غالب کی عربی سے واقفیت بہت معمولی تھی ۔۔۔ وہ عربی میں آخر تک غلطیاں کرتے رہے۔ حاشیے میں واضح کرتے ہیں کہ عربی دعاء الصباح کا انھوں نے براہِ راست ترجمہ نہیں کیا بلکہ کسی دوسرے کے فارسی نثری ترجمے کو اردو میں نظم کر دیا۔

میں پوچھتا ہوں کہ یہ بات حاشیے میں کیوں لکھی۔ اسے متن میں لکھنے میں کیا قباحت تھی۔

ص ۳۸۔ غالب کے ایک خط میں ستم پیشہ ڈومنی کا ذکر آگیا ہے۔ فلم اور ٹی وی والوں نے اس بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ مالک رام مرثیۂ محبوب کو اسی سے متعلق کرتے

ہیں۔ ان کی رائے میں یہ ڈومنی کوئی رنڈی نہیں تھی۔ اس غزل میں ایک شعر ہے،

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی بازاری عورت نہیں تھی، ورنہ کہاں کی "شرمِ رسوائی" اور کہاں کی "پردہ داریِ الفت"۔ اس شعر سے یہ بھی گمان گزرتا ہے کہ شاید اس نے خود کشی کر لی تھی۔ مالک رام نے قدیم مخطوطوں کی بنا پر اس غزل کو ۱۸۱۶ء اور ۱۸۲۱ء کے بیچ کی تصنیف قرار دیا ہے۔

ص ۵۸ تا ۶۳۔ غالب کے سفرِ کلکتہ کے آغاز کی تاریخوں کا معاملہ نہایت الجھا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں خود غالب کے، دوسرے سوانح نگاروں کے اور خود مالک رام کے بعض بیانات میں تضاد ہے۔ مالک رام نے "ذکرِ غالب" میں ان اختلافات کو درج کر کے انھیں نہیں سلجھایا۔ غالب "گلِ رعنا" کے خاتمے کی فارسی نثر میں لکھتے ہیں کہ وہ نواب احمد بخش سے ملنے ان کے پایۂ تخت (فیروز پور جھرکہ) گئے تھے (ص ۱۳۹)۔ وہاں سے دہلی واپس آئے اور روزگار دراز تک وہاں ٹھہرے۔ اس کے بعد کلکتے کے لیے روانہ ہوئے (ص ۱۵۱)۔ اس کے برخلاف مقدمۂ پنشن کے عرضی دعوے میں لکھتے ہیں کہ وہ قرض خواہوں کے ڈر سے فیروز پور جھرکہ سے دہلی نہیں گئے بلکہ براہِ راست کلکتے کے ارادے سے کان پور کے لیے روانہ ہو گئے (فسانۂ غالب، ص ۱۱۱)۔

ان متضاد بیانوں کی وجہ سے مختلف محققین نے سفرِ کلکتہ کے آغاز کی مختلف تاریخیں درج کی ہیں۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر لکھتے ہیں:

"شیخ اکرام کا قیاس ہے کہ غالب اگست ۱۸۲۶ء سے پہلے دہلی سے روانہ ہو چکے تھے (غالب نامہ، طبعِ دوم، ص ۳۵)۔ مولانا غلام رسول مہر کے مطابق اغلب یہ ہے کہ وہ ـــــ اپریل ۱۸۲۷ء میں روانہ ہوئے (غالب، طبعِ سوم، ص ۴۳)۔ مالک رام صاحب کی رائے میں وہ نومبر، دسمبر ۱۸۲۶ء میں دہلی سے روانہ ہوئے"۔ (۱)

(۱) گلِ رعنا، مقدمہ، ص ۱۷

مالک رام کو مقدمۂ پنشن کا عرضی دعویٰ ۱۹۴۳ء سے پہلے لندن میں مل گیا تھا، کیونکہ اسے انھوں نے اپنے مضمون "ذکرِ غالب" (آج کل، فروری ۱۹۴۳ء) میں پیش کیا۔ اس کے باوجود وہ ۱۹۷۰ء تک اس کے برعکس لکھتے رہے:

"وہ جب سفر پر روانہ ہوئے تھے تو چونکہ روانگی سے پہلے مولوی فضلِ حق خیرآبادی سے وداعی ملاقات نہیں کر سکے تھے، اس لیے ملنے کو دہلی واپس گئے اور پھر دوبارہ سفر پر روانہ ہوئے۔ کلیات کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔ درخواست میں انھوں نے اختصار سے کام لیا ہے اور اس کا ذکر مناسب خیال نہیں کیا"۔ (۲)

کلیات کے بیان سے مراد کلیاتِ نثرِ غالب میں مشمولہ "گلِ رعنا" کی نثر ہے درخواست سے مراد مقدمۂ پنشن کا دعویٰ ہے۔ اپنے مرتبہ "گلِ رعنا" کے مقدمے کی دوسری ہی سطر میں لکھتے ہیں:

"وہ نومبر یا دسمبر ۱۸۲۶ء میں دِلّی سے روانہ ہوئے"۔ (ص ۱۷)

یہ مؤقف "ذکرِ غالب" طبعِ چہارم میں تھا۔ طبعِ پنجم میں عرضی دعوے کے بیان کا اقتباس نقل کرتے ہیں:

"دوسروں کی نظر سے چوری چھپے، بھیس بدل کر، کسی طرح کا ساز و سامان لیے بغیر سو مشکلوں سے نواب احمد بخش خاں کے ساتھ بھرت پور کے لیے روانہ ہو گیا"۔ (ص ۵۸)

حاشیے میں لکھتے ہیں:

"یاد رہے کہ یہ نومبر، دسمبر ۱۸۲۵ء کا ذکر ہو رہا ہے"۔

گویا "ذکرِ غالب" طبعِ چہارم اور مقدمۂ گلِ رعنا کے مطابق سفرِ کلکتہ نومبر، دسمبر ۱۸۲۶ء میں شروع ہوا اور "ذکرِ غالب" طبعِ پنجم کے مطابق نومبر، دسمبر ۱۸۲۵ء میں۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر اپنے ۱۹۷۱ء کے مضمون میں لکھتے ہیں:

"خاتمۂ گلِ رعنا کی عدمِ صحت پر اگر اختصار کی دلیل لائی جا سکتی ہے تو

درخواست کے مفصّل بیانات کی عدمِ صحت پر مقدمے بازی کی مصلحتوں کے پیشِ نظر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کلکتے پہنچتے ہی غالب کو یہ احساس دلایا جا چکا تھا کہ ان کو اپنا مقدمہ پہلے دلی کے ریزیڈنٹ کے سامنے پیش کرنا چاہیے تھا"۔ (غالبیات اور ہم، ص ۲۷)

اسی لیے انھوں یہ حیلہ تراشا کہ قرض خواہوں کے ڈر سے وہ دلی نہیں جا سکتے تھے۔ وہ لکھنؤ کتنا عرصہ رہے اور لکھنؤ ایک ہی بار گئے کہ دوبارہ اس کے بارے میں مالک رام نے بحث نہیں کی۔ معتمد الدولہ آغا میر کے لیے لکھی گئی فارسی نثر کی تاریخ پر بھی روشنی نہیں ڈالی۔ مالک رام لکھنؤ میں غالب کے صاحبِ فراش ہونے کی مدت "پانچ مہینے سے کچھ دن اوپر" لکھتے ہیں (ص ۵۹)۔ حاشیے میں اسے ۱۸۲۶ء کے وسط کا ذکر قرار دیتے ہیں۔ ابو محمد سحر قیامِ لکھنؤ کی مدت کے اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شیخ اکرام کے نزدیک غالب تقریباً گیارہ مہینے لکھنؤ رہے (غالب نامہ، ص ۲۵)۔ غلام رسول مہر کے نزدیک لکھنؤ میں اتنا طویل قیام امرِ مستبعد ہے۔ زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ وہ لکھنؤ سے کان پور جا کر دوبارہ لکھنؤ آئے (غالب، ص ۴۲، بحوالہ "غالبیات اور ہم"، ص ۷۲)۔

ابو محمد سحر لکھتے ہیں:

"نومبر ۱۸۲۶ء سے جون ۱۸۲۷ء تک تقریباً آٹھ ماہ وہ یقینی طور پر لکھنؤ میں تھے۔ جس طرح انھوں نے اپنی درخواست میں مصلحتاً کلکتے کے سفر سے پہلے فیروز پور سے دلی آنے کا اظہار نہیں کیا، اسی طرح ان کا یہ بیان کہ وہ لکھنؤ میں پانچ ماہ سے کچھ اوپر مقیم رہے، کسی مصلحت پر مبنی ہے اور جب ان کے بیان کے برخلاف لکھنؤ میں ان کے قیام کی مدت کم سے کم آٹھ ماہ ثابت ہے تو یہ مدت ایک سال بھی تسلیم کی جا سکتی ہے"۔ (ایضاً ص ۷۳۔۷۵)

کاظم علی خان قیامِ لکھنؤ کی مدت پندرہ مہینے قرار دیتے ہیں (غالب کا قیامِ لکھنؤ۔ تحقیق کی روشنی میں، ہماری زبان، یکم مارچ ۱۹۸۰ء)۔

باندے میں غالب کے قیام کے سلسلے میں مالک رام حاشیہ لکھتے ہیں:

"اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک مرتبہ ۱۸۲۵ء میں جو دِلّی سے نکلے تو پھر فیروز پور، کان پور، لکھنؤ اور باندے میں ڈیڑھ سال کے قیام کے بعد سیدھے کلکتے چلے گئے"۔ (ص ۴۲)

کلکتے پہنچنے کی تاریخ ۲۱ فروری ۱۸۲۸ء ہے (ذکر، ص ۳۶)۔ اگر غالب نومبر، دسمبر ۱۸۲۵ء میں دلی سے نکلے تو دلی سے کلکتے پہنچنے تک کی مدت تقریباً سوا دو سال ہوتی ہے۔ اگر مالک رام، احسن کے جلول، غالب لکھنؤ میں محض پانچ ماہ سے کچھ دن اوپر رہے تو بقیہ ایک سال دس مہینے انھوں نے کہاں کہاں گزارے، یہ واضح کرنا چاہیے تھا، صرف اپنا موقف درج کرنا کافی نہیں۔ دوسرے اہم محققین نے اگر اس کے خلاف لکھا ہے تو اس کی تردید میں دلائل دینے چاہییں۔ ان کی عدم موجودگی میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے "غالب نامہ" جنوری ۱۹۸۱ء میں ایک طویل اور مدلل مضمون "غالب کا سفر کلکتہ" شائع کیا۔ یہ ان کے مجموعے "غالب، احوال و آثار" (لکھنؤ، ۱۹۹۰ء) میں شامل ہے۔ اس میں انھوں نے مختلف حضرات کی تحریروں کا تجزیہ کر کے غالب کے سفرِ لکھنؤ کی مختلف منزلوں کا یہ ٹائم ٹیبل تیار کیا ہے جسے سب سے زیادہ تشفی بخش مانتا ہوں۔ اس میں صفحوں کا نمبر ان کے مجموعے کے مطابق ہے۔

نومبر ۱۸۲۵ء کے آخر میں دلی سے بھرت پور کے لیے روانہ ہوئے۔ وہاں سے فیروز پور، جھرکہ گئے اور اگست ۱۸۲۶ء تک وہیں رہے (ص ۴۲)۔

ستمبر ۱۸۲۶ء میں فیروز پور سے روانہ ہو کر اکتوبر میں کان پور پہنچے (ص ۴۳)۔

نومبر ۱۸۲۶ء میں لکھنؤ پہنچے اور ۲۱ جون ۱۸۲۷ء تک وہاں رہے۔ ۲۲ جون کو وہاں سے چل کر ۲۵ جون ۱۸۲۷ء کو کان پور پہنچے (ص ۳۳)۔

آغا میر کے نام عرض داشت اپریل یا مئی ۱۸۲۷ء میں لکھی گئی ہو گی (ص ۶۸)۔

کان پور میں دو تین دن قیام کر کے جولائی ۱۸۲۷ء کے پہلے ہفتے میں باندہ پہنچے ہوں گے (ص ۸۰، ۷۹)۔

جولائی ۱۸۲۷ء کے پہلے ہفتے سے ستمبر کے اواخر یا اکتوبر ۱۸۲۷ء کے اوائل تک باندہ رہے۔ (اوائل اکتوبر سے نومبر کے دوسرے ہفتے تک کا حساب نہیں دیا گیا۔ گیان چند)

نومبر کے دوسرے ہفتے میں وہاں سے روانہ ہوئے۔ ۱۵ نومبر کو سودھا پہنچے تھے۔ ۱۹ نومبر کو وہاں سے روانہ ہو کر آئندہ شب ایک گاؤں میں بسر کی۔ ۲۰ نومبر کو چلہ تارا پہنچے، وہاں سے کشتی لے کر، ۲۷ نومبر کو الٰہ آباد پہنچے (ص ۸۰)۔

۲۸ نومبر ۱۸۲۷ء سے کشتی کے ذریعے الٰہ آباد سے روانہ ہوئے۔ زیادہ سے زیادہ یکم دسمبر ۱۸۲۷ء تک بنارس پہنچ گئے ہوں گے (ص ۸۱)۔

۲۹ دسمبر ۱۸۲۷ء کو بنارس سے کلکتے کے لیے روانہ ہوتے اور ۵۳ دن میں ۱۹ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتے پہنچے (ص ۸۵)۔

۱۵ اگست ۱۸۲۹ء کو کلکتے سے روانہ ہوئے۔ ۳۰ اکتوبر ۱۸۲۹ء کو باندہ پہنچے۔ چند روز کے بعد وہاں سے چل کر ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو دلی واپس چلے آئے (ص ۸۵)۔

ص ۳۳ (ذکر غالب)۔ مصنف حاشیے میں مطلع کرتے ہیں کہ سفرِ کلکتہ کے دوران انھوں نے باندہ کے ایک شخص امی چند سے دو ہزار روپیہ قرض لیا تھا۔ اس سلسلے میں محمد مشتاق شارق نے اپنے یکم ستمبر ۱۹۷۷ء کے مکتوب میں مالک رام کو مطلع کیا کہ اس کا صحیح نام امی کرن تھا اور وہ فرم " سیٹھ ہری کرن روی کرن مہتا بینکرز باندہ کے روی کرن کا بیٹا تھا "۔ مالک رام نے شارق کا یہ مکتوب " تحریر " بابت اکتوبر دسمبر ۱۹۷۷ء، ص ۱۱۱ پر شائع کر دیا۔

ص ۶۷۔ کلکتے کے مشاعرے میں غالب نے "ــــ میاں برخیزد" والی متنازع فیہ غزل پڑھی تھی۔ مالک رام ۱۹۳۹ء میں کلکتے گئے تو متعدد بزرگوں سے مشاعرے کی عمارت اور حاضرین وغیرہ کی صحیح تفصیل معلوم کر کے درج کی۔

ص ۶۹۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتے میں غالب کے تین معترضین کی شناخت کی۔ یہ تھے : احمد علی گوپاموی، احمد علی مدرسِ مدرسۂ عالیہ اور مولوی وجاہت علی دفترِ انشاگورنر جنرل۔ مالک رام لکھتے ہیں کہ احمد علی گوپاموی اور وجاہت لکھنوی کے بارے میں وہ کچھ کہنے سے قاصر ہیں، لیکن دوسرے احمد علی کے بارے میں تصحیح کی کہ وہ سفرِ کلکتہ کے بعد ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے، ان کا تعلق " قاطعِ برہان " کے معرکے سے ہے تھا۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے اپنے مضمون " غالب کے شاگرد، معتقدین اور مخالفین" میں احمد علی گوپاموی کے حالات تفصیل سے (ص ۶۸ - ۷۹) اور وجاہت علی کے مختصرا (ص ۷۹) میں لکھے ہیں۔ (بنگال میں اردو زبان و ادب چند تحقیقی مضامین، لکھنؤ، ۱۹۷۶ء)

ص ۷۵ تا ۸۶ - مالک رام نے مقدمۂ پنشن کی تفصیلات بہت تفصیل سے اور سلجھا کر بیان کی ہیں - آخری فیصلے کے سلسلے میں ۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۴ء کی محکمۂ پولٹیکل کی تین دستاویزوں کا حوالہ دیتے ہیں۔

ص ۹۰ - عام خیال یہ ہے کہ غالب جوئے کی لت میں ایک ہی بار ماخوذ ہوئے تھے، لیکن مالک رام نے اضافہ کیا کہ ۱۸۴۱ء میں بھی اس سلسلے میں مرزا کے مکان پر چھاپا پڑا تھا۔ ان پر سو روپے جرمانہ ہوا جس کی عدم ادائیگی کی صورت میں چار مہینے قید خانے میں رہنا پڑتا۔ بظاہر انھوں نے جرمانہ ادا کر دیا۔ سند: "دہلی اردو اخبار" ۱۵، اگست ۱۸۴۱ء - کالی داس گپتا کے مطابق یہ دریافت مالک رام کی اولیات میں ہے۔ (غالبیات میں اولیات مالک رام، مالک نامہ، ص ۶۸)۔

ص ۱۰۵ غالب کے بیان کے مطابق، مالک رام لکھتے ہیں کہ مرزا یوسف نے ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۷ء کی رات کو سخت بخار میں انتقال کیا۔ متن میں یہ لکھنے کے بعد فٹ نوٹ میں معین الدین حسن خان اور بگا بیگم کا یہ بیان درج کرتے ہیں کہ مرزا یوسف گھر سے باہر نکل کر ٹہلنے لگے کہ مارے گئے۔ اب میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اس اختلافی بیان کو حاشیے میں کیوں دیا، متن ہی میں کیوں نہیں؟ چونکہ اس کی بات صحیح تر ہے، اس لیے متن میں مالک رام کو ترجیحاً یہی درج کرنا چاہیے تھا، اس کے بعد غالب کا "دستنبو" کا بیان دیتے کہ ان کے بھائی بخار سے مرے۔

ص ۱۱۳ تا ۱۳۳ - ۱۸۴۴ء سے ۱۸۵۷ء تک غالب اپنی پنشن میں اضافے کی جنگ لڑا کیے اور اس میں ناکام رہے۔ ۱۸۵۸ء کے بعد سے ضبط شدہ قلیل پنشن اور دربار و خلعت کی بحالی کے لیے جہاد کرتے رہے۔ اس سلسلے میں مالک رام نے غالب کے خط بنام حقیر مؤرخہ ۲۹ مئی ۱۸۶۳ء کی طرف توجہ دلائی ہے کہ سرکار نے ان کی پنشن میں پانچ روپے مہینا وضع کر کے اسے محض ستاون روپے آٹھ آنے کر دیا۔ مالک رام لکھتے

ہیں کہ یہ ناقابلِ فہم معما ہے، کیونکہ اس خط کے علاوہ انھوں نے کبھی نہیں لکھا کہ غدر سے پہلے انھیں کبھی ساڑھے باسٹھ سے کم ملے ہوں (ص ۱۱۷)۔

بہرحال وہ اپنی دوسری جنگ میں کام یاب ہو گئے، مئی ۱۸۶۰ء میں پنشن بحال ہو گئی اور ۳ مارچ ۱۸۶۳ء کو دربار و خلعت بھی بحال ہو گیا (ص ۱۱۹)۔ ہر بات کی صحیح تفصیلات "ذکرِ غالب" میں کماحقہٗ ملتی ہیں۔

غالب کی زندگی کی ان دو جنگوں کے علاوہ آخری ایام میں "برہانِ قاطع" کا معرکہ بھی بہت اہم تھا۔ مالک رام نے سوانح کے باب میں اس کے بارے میں ایک لفظ نہیں لکھا بلکہ دوسرے باب میں تصنیفات کے بعد دیا ہے۔ ضرورت تھی کہ سوانح میں بھی اس کا ذکر، مختصراً ہی سہی، کیا جاتا۔

"ذکرِ غالب" کا دوسرا باب تصنیفات کے بارے میں ہے جس میں غالب کی زندگی اور بیسویں صدی میں مدوّن مجموعوں کے بارے میں صحیح تفصیلات دی ہیں۔ مثلاً "سبدِ چین" کے بارے میں یہ بتایا کہ اس کا پہلا ایڈیشن نومبر ۱۸۵۸ء کے پہلے ہفتے میں بازار میں آیا (ص ۱۴۹) یا "باغِ دو در" کے بارے میں یہ تعین کہ اس میں "سبدِ چین" سے ۱۳۶ شعر زیادہ ہیں (ص ۱۵۶)۔ ایک بحث ہے کہ غالب کا اردو دیوان کب مرتب ہوا۔ میں اس مقالے میں آگے چل کر ایک مضمون کے سلسلے میں ذکر کروں گا۔ "ذکرِ غالب" میں اپنے پہلے کے موقف میں نرمی برت کر لکھتے ہیں:

> "میرا خیال ہے کہ اس زمانے میں شاید انھوں نے صرف اردو کلام کا ایک مفصل انتخاب مرتب کیا جو متداول دیوان کی اوّلین یا ابتدائی شکل کہی جاسکتی ہے اور اس کے لیے دیباچہ بھی لکھا"۔ (ص ۱۶۵)

مالک رام نے اس پر توجہ نہیں کی کہ کلکتے کا فارسی دیباچہ صریحاً صرف "گلِ رعنا" کا دیباچہ ہے جس کے آخر میں "گلِ رعنا" کا نام بھی دیا ہے۔ متداول دیوان کا دیباچہ اس سے مختلف ہے۔ اس لیے کون جانے کہ انھوں نے کلکتے میں اردو دیوان کا انتخاب کیا تھا کہ نہیں۔ اس سلسلے میں مالک رام لکھتے ہیں کہ دیوان کے پہلے ایڈیشن

کے ساتھ غالب کا اپنا فارسی دیباچہ اور آخر میں ضیاء الدین احمد خان کی تقریظ ہے جو ۱۲۵۴ھ میں لکھی تھی (ص ۱۹۵)۔ لیکن مصنف نے اس اہم نکتے کو قلم انداز کر دیا کہ متداول دیوان کے دیباچے کی تاریخ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۳۸ھ ہے جو نظامی بدایونی نے کسی قلمی نسخے میں دیکھی تھی۔

تصانیف کے باب میں آخری جزو (ج) "قاطعِ برہان" کا معرکہ ہے کہ جس میں تمام ضروری معلومات تحقیق کے ساتھ یک جا کر دی ہیں۔ انھوں نے اس موضوع کو "معاصرات و اخلاق" کے باب میں بھی لیا ہے۔ میں اس کے بیان کو یہیں لیتا ہوں۔

وہ مصنفِ "قاطعِ برہان" کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"بہرحال ایک بات بالکل واضح ہو گئی کہ مرزا اپنے دعوے میں حق بجانب تھے۔ انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستانی فارسی داں ہرگز قابلِ اعتبار نہیں"۔ (ص ۲۳۹)

یہ دعویٰ غالب کی طرف داری معلوم ہوتا ہے۔ قاضی عبدالودود نے اپنے مضمون "غالب بحیثیت محقق" میں دکھایا کہ غالب کی فارسی دانی اغلاط سے خالی نہیں۔ نہ صرف فارسی بلکہ انھوں نے اردو زبان بھی غلط استعمال کی ہے اور وہ علومِ ادبیہ: عروض و قافیہ وغیرہ کی بھی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

قاضی صاحب نے اپنے نام حافظ محمود شیرانی کا ایک خط شائع کیا ہے جس کا ایک اقتباس یہ ہے:

"غالب کو فنِ لغت اور اس کی روایات سے کچھ دل چسپی نہیں معلوم ہوتی ورنہ ایک شخص کو جو ان سے دو صدی قبل گزرا ہے اور جس کا دعویٰ ہے کہ میری حیثیت ایک مدوّن کی ہے نہ موجد کی، اپنی طباعی اور ذہانت کا نشانہ نہ بناتے ـــ برہان قاطع کی قدر اس وقت معلوم ہوتی ہے جب خود ایرانیوں کو اس کا حوالہ دیتے دیکھتے ہیں"۔

(غالب بحیثیت محقق، نقدِ غالب، ص ۳۴۹)۔

ڈاکٹر نذیر احمد کی رائے ہے:

"اگرچہ مرزا غالب کے اکثر اعتراض غلط ہیں، لیکن اس سے یہ اندازہ لگانا صحیح نہ ہوگا کہ برہانِ قاطع ہر طرح کے اسقام سے پاک ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس فرہنگ میں بعض بنیادی خرابیاں ہیں، لیکن غالب مسائلِ فرہنگ نویسی سے کما حقہٗ آگاہ نہ تھے، اس بنا پر ان کی نظر ان خرابیوں تک نہ پہنچ سکی"۔
(نقدِ قاطعِ برہان مع ضمائم، ۱۹۸۵ء، ص ۲۳۹)

مالک رام "قاطعِ برہان" کے علمی موقف میں غالب کی کتنی بھی طرف داری کریں، لیکن اس کے لہجے کے بارے میں بے لاگ اور غیر جانب دار ہیں۔ غالب کی اشاعتِ "قاطعِ برہان" پر لکھتے ہیں:

"پھر اس کے بعد جس طرح شرم و حیا اور تہذیب و شرافت کی مٹی پلید ہوئی، وہ ہماری ادبی تاریخ کا بہت ہی افسوس ناک باب ہے، لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ اگر "البادیٔ اظلم" کے اصول سے دیکھا جائے تو اس کے لیے بہت حد تک میرزا خود ذمے دار تھے۔ انھوں نے اپنی درشت گفتاری کی جو توجیہ کی ہے، وہ بہت بودی ہے"۔ (ص ۲۳۸)

واضح ہو کہ "ذکرِ غالب" طبعِ دوم میں انھوں نے غالب سے زیادہ ان کے مخالفین کو جھگڑے بازی کا مجرم قرار دیا تھا، شرم و حیا اور تہذیب و شرافت کی مٹی پلید کرنے کا ذمے دار غالب کے مخالفین کو ٹھہرایا تھا۔ قاضی عبدالودود کے اعتراض کے بعد مخالفین کی بات حذف کر کے اسے عمومی بنا دیا۔

"ذکرِ غالب" کا تیسرا باب 'عادات و اخلاق' ہے۔ اس کا بہتر عنوان 'شخصیت' ہو سکتا تھا۔ یہ باب بھی بہت مفصّل، اور بھرپور ہے۔ مثلاً لباس کے عنوان کو دیکھیے، معلوم ہوتا ہے مصنف برسوں، رات دن مرزا کے ساتھ رہے ہیں۔ یہ جزئیات اور کہیں دکھائی نہیں دیں، کم از کم "یادگارِ غالب" میں تو نہیں۔ "دلّی میں سکونت" کے عنوان کے تحت ان مکانوں کی تفصیلات ہیں جن میں مرزا رہے ہیں۔ ان میں میرے

لیے سب سے زیادہ چونکانے والی بات یہ ہے کہ نواب انورالدولہ کے نام ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں کہ "۳۰ سال ہوئے کہ میں نے خانہ و کاشانہ فروخت کر دیا ہے"۔ اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں، لیکن مالک رام کا قیاس ہے کہ یہ ۱۸۵۵ء سے پہلے کا ہے۔ ممکن ہے انھوں نے کلکتے کے سفر سے پہلے ذاتی مکان کو اونے پونے فروخت کر دیا ہو کیونکہ سفر کے لیے بڑی رقم درکار تھی (ص ۱۹۹)۔

مصنّف نے غالب کی اس بات پر داد دی ہے کہ واجد علی شاہ معزول ہو گئے جب بھی غالب نے ان کے لیے قصیدہ لکھ کر بھیجا (ص ۲۴۴)۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ غالب نے ان کی معزولی کے بعد بھی مدح سرائی سے ہاتھ نہ کھینچا۔ غالب کے مذہب کے سلسلے میں مصنّف لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے شیعہ اور سنّی دونوں مسلکوں کے دوستوں پر اپنی شیعیت کا اظہار کیا۔ ص ۲۴۴ پر مجروح کے نام کے خط کے بعد قوسین میں لکھتے ہیں (مجروح سنّی)۔

میرے سامنے کالی داس گپتا رضا کا "مؤکرِ غالب" کا نسخہ ہے۔ انھوں نے یہاں "سنّی" کاٹ کر "شیعہ" لکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں مصنّف یا کاتب نے سہواً "سنّی" لکھ دیا ہو گا، کیونکہ مالک رام نے تلامذۂ غالب میں مجروح کو صریحاً "اثنا عشری شیعی" لکھا ہے، (طبع دوم، ص ۲۴)۔

مالک رام مسلک کے بارے میں غالب کی وسعتِ نظر کی یوں نشان دہی کرتے ہیں:

"شیعیت کو اگرچہ عقیدے کی حیثیت سے تو بے شک نہیں، لیکن بالعموم تصوف سے ایک قسم کا بَیر ضرور رہا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں شیخ اور بیعت کا تصور سرے سے مفقود ہے"۔ (ص ۲۴۸)

اس کے باوجود غالب اپنے صوفی ہونے کا بھی شد و مد سے اعلان کرتے ہیں:

"وہ حضرت مولانا فخرالدین کے پوتے مولانا نصیرالدین عرف میاں کالے سے بیعت بھی تھے۔ کون کٹر شیعی کسی غیر شیعی، سنّی، صوفی کے ہاتھ پر بیعت کرے گا؟" (ص ۲۴۹)

قاضی عبدالودود نے اپنے تبصرے میں اس بیان کے ماخذ کے عدمِ اظہار پر اعتراض کیا تھا۔ طبعِ پنجم میں حاشیے میں میر مہدی مجروح کے خط کا حوالہ دیتے ہیں:

"سنو، میر نصیرالدین اولاد میں سے ہیں شاہ محمود اعظم صاحب کے۔ وہ خلیفہ تھے مولوی فخرالدین صاحب کے، اور میں مرید ہوں اس خاندان کا"۔
(اردوئے معلیٰ، ۲۸)۔

مالک رام واضح کرتے ہیں:

"مولانا فخرالدین اور ان کے صاحب زادے مولانا غلام قطب الدین دونوں کا آگے پیچھے ۱۷۸۵ء میں یعنی غالب کی ولادت سے بارہ تیرہ برس پہلے انتقال ہوا۔ ظاہر ہے کہ وہ مولانا غلام قطب الدین کے صاحب زادے میاں کالے صاحب ہی کے مرید ہو سکتے ہیں"۔ (حاشیہ ۲۴۹)

مالک رام کا استدلال درست ہو سکتا ہے، لیکن غالب نے "بیعت" کا لفظ استعمال نہیں کیا، صرف مرید ہونا لکھا ہے اور وہ بھی میاں کالے ہی کا نہیں بلکہ اس پورے خاندان کا۔ مرید ہونے سے کہیں ان کی مراد محض عقیدت مندی تو نہیں؟ بہرحال مصنف نے بڑی خوبی سے غالب کے مسلک کی سیر چشمی افشا کی ہے۔ اس باب کے آخری حصے میں مصنف نے ایک بہت دل چسپ معلومات بہم پہنچائی ہے جس سے میں واقف نہ تھا۔

"ان میں ایک صفت ایسی تھی جو ترکوں میں نہیں پائی جاتی۔ ترکوں میں ایجاد اور اختراع کا مادّہ سرے سے نہیں۔ آپ کوئی ایسی مثال پیش نہیں کر سکتے جہاں کسی ترک نے کسی میدان میں کوئی نئی دریافت کی ہو۔ میرزا اس کلیے سے مستثنیٰ تھے"۔ (ص ۲۵۳)

غرض یہ ہے کہ اس باب میں غالب کی نفسیت، محبت، عقیدت، ادب، نفرت وغیرہ کا مطالعہ خوب خوب ہے۔

مختار الدین احمد اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"امراؤ بیگم، حسین علی خاں اور باقر علی خاں کے سنینِ وفات اور حسین علی خاں کے مدفن کے معلومات پہلی مرتبہ اسی کتاب میں ملتے ہیں"۔

(ذکرِ غالب، مشمولہ "مالک رام، ایک مطالعہ"، ص ۵۷)

"ذکرِ غالب" سوانحِ غالب کا مستند گنجینہ ہے، یہی وجہ ہے کہ غالب کی زندگی کے واقعات اور تصانیف کے بارے میں کچھ جاننا ہو تو ہم "ذکرِ غالب" پر جس قدر اعتماد کر سکتے ہیں، اتنا کسی اور سوانح عمریِ غالب پر نہیں۔

مرزا غالب (انگریزی)

یہ کتاب نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی نے لکھائی ہے۔ انھوں نے قومی سوانح عمریوں کا سلسلہ شروع کیا اور یہ اس سلسلے کی چوبیسویں کتاب ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۸ء میں اور دوسرا ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا، میرے سامنے آخر الذکر ہے۔ اس میں متن کے ۸۸ صفحے ہیں۔ عرش ملسیانی اپنے مضمون "نگارشاتِ مالک رام" میں اطلاع دیتے ہیں کہ اس کتاب کا ترجمہ ذیل کی زبانوں میں ہو چکا ہے:

"ہندی، پنجابی، گجراتی، مراٹھی، تیلگو ــــ اس کا اردو ترجمہ پاکستان میں مولوی محمد اسماعیل پانی پتی نے کیا ہے"۔

(ارمغانِ مالک، اول، ص ۵۱)

اس کتاب میں دو ابواب ہیں۔ پہلا طویل باب سوانح کا ہے اور ۵۸ صفحوں کو محیط ہے۔ اس میں غیر اردو قارئین کے لیے غالب کی سوانح کو جس اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے، اسے دیکھ کر عش عش کرنا پڑتا ہے۔ گاگر میں ساگر کی بہترین مثال ہے۔ مصنف کی انگریزی پر قدرت بھی داد طلب ہے۔ سوانح کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"اس کے ایک فارسی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنا ذاتی مکان بھی خرید لیا تھا اور اس میں منتقل ہو گیا تھا۔ لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ وہ اپنے خسرالٰہی بخش خاں کے ساتھ کب تک مقیم رہا"۔ (ص ۱۵)

دوسرے مختصر باب کا عنوان " غالب کا آرٹ " ہے۔ اس میں تین صفحوں کی تمہید کے بعد ص ۶۱ تا ۸۸ پر غالب کی منتخب غزلوں کے تراجم مختلف عنوانات کے تحت دیے ہیں۔ ترجمے نثری نظم میں معلوم ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ خود مصنف کے کیے ہوئے ہیں۔

کتاب جس سلجھے ہوئے انداز، ایجاز و استناد کے ساتھ لکھی گئی ہے، اسے دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ یہ اردو میں بھی ان قارئین کے لیے پیش کر دی جائے جو سوانح غالب کی تحقیقی موشگافیوں سے دل چسپی نہیں رکھتے بلکہ سوانح کے بارے میں ضروری معلومات چاہتے ہیں۔ پاکستان میں اس کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے، اسی کو ہندوستان میں بھی چھاپ دینا چاہیے۔

تلامذۂ غالب

بعض تذکرے کسی ایک ہی استاد کے شاگردوں کے حالات پر مشتمل ہوتے ہیں، مثلاً سوہن لال انیس کا تذکرہ " انیس الاحبا " مرزا فاخر مکین کے شاگردوں کا تذکرہ ہے۔ مالک رام نے بھی ایک جامع تذکرہ " تلامذۂ غالب " کے نام سے مرتب کیا۔ اب تک اس کے دو ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ ۱۔ طبع اول ادارۂ تصنیف و تالیف، نکودر (پنجاب)، ۱۹۵۸ء۔ ۲۔ دوسرا اضافہ و ترمیم شدہ ایڈیشن مکتبۂ جامعہ، دلی، ۱۹۸۴ء۔ مصنف نے طبع دوم کے دیباچے میں کتاب کی شانِ نزول یوں بیان کی ہے:

> " وہ ۳۹ - ۱۹۳۸ء میں مرزا قتیل کے حالات کی تحقیق کر رہے تھے۔ اسی سے خیال ہوا کہ کیوں نہ غالب کے شاگردوں کے حالات جمع کر دیے جائیں۔ اگلے ۱۵ سال وہ بسلسلۂ ملازمت ملک سے باہر رہے، لیکن وہاں رہتے ہوئے بھی تلامذۂ غالب کی تیاری کرتے رہے۔ اخیر ۱۹۵۳ء سے اخیر ۱۹۵۸ء تک وہ ہندوستان میں رہے جہاں ۱۹۵۸ء میں کتاب شائع ہوئی۔ اس میں غالب کے ۱۳۶ شاگردوں کے حالات اور نمونۂ کلام مختلف قلمی اور مطبوعہ کتابوں اور رسالوں

سے لے کر ترتیب دیے ہیں ۔ ان کے علاوہ حواشی میں دوسرے ۲۹ حضرات کے حالات ہیں جو غالب کے شاگرد نہیں "۔

" تلامذۂ غالب" طبع اوّل پر بہت سے تبصرے شائع ہوئے جن میں خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ اغلاط کی تصحیح بھی کی گئی ہے ۔ ان میں سب سے اچھا مضمون ڈاکٹر خنیف نقوی کا " تلامذۂ غالب پر ایک نظر" رسالہ اکادمی لکھنؤ ، بابت جنوری فروری ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا ۔ مالک رام نے " تلامذۂ غالب" طبع دوم کے دیباچے میں اسی مضمون کو بہترین بتایا ہے ۔ خنیف نے اپنے مضمون میں دوسرے تبصروں کی یہ فہرست دی ہے ۔

۱ ۔ تمکین کاظمی	تحریک دہلی ، مارچ ۱۹۵۹ء
۲ ۔ نثار احمد فاروقی	۱۹۵۹ء ۔ باز طباعت ۔ تلاش غالب ، ۱۹۶۹ء
۳ ۔ مشفق خواجہ	غالب اور تلامذۂ غالب تذکرۂ بشیر میں ۔ رسالہ اردو کراچی ، غالب نمبر ، جنوری مارچ ۱۹۶۹ء
۴ ۔ کلب علی خان فائق رام پوری کچھ تلامذۂ غالب کے بارے میں	
۵ ۔ ڈاکٹر وحید قریشی	تلامذۂ غالب ، ماہِ نو کراچی ، جنوری فروری ۱۹۶۹ء
۶ ۔ مغیث الدین فریدی ۔	تلامذۂ غالب کی تاریخی غلطیاں ، مشمولہ اردو تحقیق اور مالک رام " ۔ ۱۹۷۵ء (رسالہ اکادمی لکھنؤ ، جنوری فروری ۱۹۸۳ء ، ص ۱۶ ۔ ۱۷)

خنیف نقوی کے مضمون کے علاوہ نثار احمد فاروقی کا مضمون بھی اہم ہے ۔ ان تبصروں اور اپنی ذاتی تحقیق کی مدد سے مالک رام نے دوسرے ایڈیشن میں کافی ترمیم و تصحیح و اضافہ کیا ۔ پہلے ایڈیشن میں ۱۳۶ شاگردوں کے حالات ہیں ، دوسرے میں ۱۸۱ کے ۔ ان میں شامل کیجیے ضمیمے کے حکیم مولا بخش قلق میرٹھی کو جو غالب کے باضابطہ شاگرد نہیں تھے ، لیکن غالب نے ان سے استصواب کیے بغیر ان کے انگریزی نظموں کے منظوم تراجم کی اصلاح کر دی تھی ۔ دوسرے ایڈیشن میں طبع اوّل کے دو ایک نام حذف کر دیے ہیں ، کیونکہ ان کا شاگردِ غالب ہونا مشکوک تھا ۔ طبع اوّل میں حواشی میں

ان ۲۹ حضرات کے حالات ہیں جو شاگرد نہیں ۔ طبعِ دوم میں ایسے حاشیہ نشینوں کی تعداد ۳۰ ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر حنیف نقوی نے "تلامذۂ غالب" طبعِ دوم پر بھی تبصرہ لکھا ۔ تلامذۂ غالب (طبعِ ثانی) پر ایک نظر ، اکادمی ، لکھنؤ ، جولائی اگست ۱۹۸۶ء ۔

حنیف نے اپنے دونوں مضامین میں نہایت پُر مغز تصحیحات اور اضافے تجویز کیے ہیں جن میں سے بہت سے غالب کے مشہور شاگردوں کے حالات میں ہیں ۔ ان کے دونوں تبصرے ان کے مجموعے "غالب ، احوال و آثار" (لکھنؤ ، ۱۹۹۰ء) میں شامل ہیں۔

"ارمغانِ مالک" میں عرش ملسیانی نے لکھا ہے کہ "تلامذۂ غالب" میں غالب کے ۳۰ شاگردوں کی تصویریں ہیں ، لیکن "تلامذہ" کی طبعِ اول کے دیباچے میں صرف ۲۷ تصویروں کے ماخذ کی اطلاع دی ہے ۔ ان میں زکی تخلص کے محض ایک شاعر کی تصویر کا ماخذ بتایا جاتا ہے جبکہ متن میں زکی تخلص کے دو شاعروں کی تصویریں ہیں ۔ دیباچے میں مندرج حکیم محمود الحق محمود دہلوی کی تصویر کتاب سے غیر حاضر ہے ، پریس میں چھپنے سے رہ گئی ہو گی ۔ دوسرے ایڈیشن میں بھی یہ تصویر نہیں ۔ اس ایڈیشن میں سات نئی تصویریں ہیں ۔ اس طرح طبعِ دوم میں واقعی محض ۳۳ تصویریں ہیں۔

طبعِ اوّل کے دیباچے میں تصویروں کے ماخذ درج کرتے وقت دو ناموں کو غلط لکھ دیا ہے : "رشکی ، نواب محمد اسماعیل خان بالقابہ میرٹھ (نواب محمد اسحاق خان مرحوم کے صاحب زادے اور رشکی کے بھتیجے" ۔

یہاں رشکی تخلص کے آگے کسی التباس کے تحت ان کے بھتیجے کا ذکر کر دیا ہے ۔ طبعِ دوم کے متن میں رشکی کا نام نواب محمد علی خان ہے اور یہ شیفتہ کے بھتیجے ہیں ۔ یہی کیفیت شوکت کی ہے ۔ دیباچے میں ان کا نام یوں لکھا ہے :

> "شوکت ، جناب میاں محمد مکرم خان بھوپال (شوکت کے پوتے) بوساطت جناب نادم سیتاپوری" ۔

طبعِ دوم کے متن میں ان کا صحیح نام یار محمد خان دیا ہے ، لیکن ان کی تصور غیر حاضر ہے ۔ ظاہر ہے ، دیباچے میں شوکت تخلص کے آگے ان کے پوتے کا نام لکھ دیا ہے ۔

معلوم نہیں، اس قسم کا التباس کیونکر ہوا۔ مصنف طبعِ دوم کے دیباچے میں میں تصحیح کرتے ہیں کہ حیدر آباد سے شائع ہونے والی کتاب "ذکرِ سالک" میں سالک کی جو تصویر دی ہے، وہ دراصل سراج الدین احمد خان سائل کے عہدِ شباب کی تصویر ہے (طبعِ دوم، ص ۱۳)۔

اس تذکرے کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر شاگرد کے حالات کے فوراً بعد ماخذ کا اظہار کر دیا ہے۔ کئی ایسے اصحاب ہیں جنھیں بعض لوگوں نے غالب کا شاگرد کہا ہے، لیکن مالک رام اسے نہیں مانتے، اس لیے انھیں اس بزم میں بار نہیں دیا۔ مثلاً باقر علی خان کامل، نظام رام پوری، بنواری لال شعلہ، سید محمود آزاد وغیرہ۔

کون غالب کا شاگرد ہے اور کون نہیں، بعض صورتوں میں اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے، بڑے بڑے علما دھوکا کھا جاتے ہیں۔ دیباچہ طبعِ اوّل میں مالک رام نے اطلاع دی کہ نساخ، خواجہ عبدالرؤف عشرت، حسرت موہانی، مصنفِ "مشرق بنگال میں اردو" نے بعض مبیّنہ شاگردوں کا غلط انتساب کیا۔ دوسری طرف وہ ایک گل دستے "ترقیِ سخن" بمبئی، شمارہ نومبر ۱۹۱۳ء سے ایک شاعر ڈاکٹر فدا حسین تمیزِ غالب کی ایک غزل درج کرتے ہیں۔ غزل ادق اور سراسر مہمل ہے۔ کسی نے استہزا کے طور پر لکھ دی ہو گی۔ مالک رام صاحب نے اس شخص کو شاگردوں کی فہرست میں بجا طور پر جگہ نہیں دی۔ حیدر آباد میں عبدالصمد خان نے گل دستوں میں مجھے دو ایک شعرا کا کلام دکھایا جن میں انھیں غالب کا شاگرد لکھ دیا گیا تھا۔ بعض مجہول الاسم شاعر خود کو معتبر بنانے کے لیے شاگردیِ غالب کا دعویٰ کر دیتے تھے۔

رسالہ "اردو" غالب نمبر ۱۹۲۹ء میں مضمون نگار کے نام کے بغیر مضمون شائع ہوا "غالب اور تلامذۂ غالب تذکرۂ بشیر میں"۔ چونکہ اس کی تمہید کے نیچے مشفق خواجہ کا نام درج ہے، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہی مضمون نگار ہیں۔ انھوں نے کئی شاگردوں کا ذکر کیا جن میں سے بیش تر "تلامذۂ غالب" طبعِ دوم میں ملتے ہیں، چند نہیں۔ مالک رام نے انھیں معتبر نہیں مانا ہو گا۔ اسی پرچے میں کلبِ علی خان فائق رام پوری کا مضمون "کچھ تلامذۂ غالب کے بارے میں" ہے۔ انھوں نے

" تلامذۂ غالب " طبع اوّل میں مذکور سید محمد سلطان عاقل کو غالب کا شاگرد نہیں مانا، مالک رام نے طبعِ دوم میں بھی انھیں شامل کیا ہے۔ فائق نے بنواری لال شعلہ کو بال مکند بے صبر کے علاوہ غالب کا بھی شاگرد قرار دیا۔ مالک رام اس سے بھی متفق نہیں۔ فائق نے حسبِ ذیل نئے شاگردوں کا اضافہ کیا:

افضل علی ابر ، محمد دلاور علی ثاقب ، نواب محمد حسین علی سلطان نسیم ، منشی تہور علی تہور ، حکیم مسیح الزماں مظلوب مراد آبادی۔

مالک رام نے ان میں سے صرف نسیم کو طبع دوم میں جگہ دی، وہ بھی کسی دوسرے ماخذ کے حوالے سے، بقیہ ناموں میں سے کسی کو شامل نہیں کیا۔ اکثر مضمون نگار کہیں بھی کسی شاعر کو شاگرد غالب لکھا دیکھ کر اس کا نام تلامذہ کی فہرست میں داخل کر دیتے ہیں، ان کی دریافت جو ٹھہری۔ مالک رام جب تک مطمئن نہیں ہو جاتے، ایمان نہیں لاتے۔ رسالہ " اردو " غالب نمبر ۱۹۶۹ء ان کے ماخذ میں ہے۔ اس کے باوجود اگر انھوں نے فائق کے نودریافت شعرا کو بزم تلامذہ میں بار نہیں دیا تو اس کی یہی وجہ ہوگی کہ وہ شہادت کو ناکافی سمجھتے ہوں گے۔

نثار احمد فاروقی نے اپنے مجموعے " تلاشِ غالب " میں اس کتاب پر تبصرہ کیا ہے۔ اس کی خوبیوں کا بھرپور اعتراف کر کے انھوں نے بعض جزئیات کی اصلاح کی ہے جن میں قابلِ ذکر یہ ہیں:

الف۔ " تلامذہ " کی طبعِ اوّل میں لکھا تھا کہ فارسی اور عربی میں حالی کا مختصر دیوان موجود ہے۔ نثار صاحب نے واضح کیا کہ ان زبانوں میں حالی کا کچھ کلام ملتا ہے لیکن دیوان نہیں۔ طبعِ دوم میں مالک رام نے وضاحت سے ص ۱۳۹ پر لکھا:

> " اردو کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی یکساں دست گاہ تھی۔ ان زبانوں میں ان کا دیوان مختصر، ضمیمۂ اردو کلیات حالی مشتمل بر نظم و نثرِ فارسی و عربی، ان کی وفات سے چند ماہ پیش تر ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا تھا "۔

(مجلّہ ہند پریس، دہلی)

ب ۔ قاضی عنایت حسین بدایونی رشکی کے لیے فاروقی نے دعویٰ کیا ہے کہ ان کا تخلص اشکی تھا، رشکی نہیں۔

ج ۔ نثار احمد فاروقی نے ایسے ۴۴ شعرا کی فہرست دی جن کے تلمذ کی کوئی سند نہیں دی گئی جس کی وجہ سے ان کا تلمذ مشکوک ہے۔ "تلامذہ" کی طبع دوم میں ہر شاگرد کے حالات کے بعد ماخذ کا اظہار کر دیا ہے۔

د ۔ الگزنڈر ہیڈرلے آزاد کو تذکرے میں جگہ نہیں دی گئی، حالانکہ وہ بالیقین غالب کے شاگرد تھے۔

مالک رام نے طبع دوم کے دیباچے میں دو صفحوں پر بحث کر کے ثابت کیا کہ آزاد غالب کے نہیں، زین العابدین خاں عارف کے شاگرد تھے۔ اس سلسلے میں دلیلِ قاطع آزاد کے بڑے بھائی ٹامس ہیڈرلے کا اردو دیوان ہے جس کے دیباچے میں آزاد کو صریحاً عارف کا شاگرد لکھا ہے۔

ہ ۔ شعرا کے نمونۂ کلام سے نثار صاحب نے ایسے ۳۱ مصرعے نقل کیے ہیں جو غیر موزوں ہیں۔ انھوں نے ان سب کی قیاسی تصحیح کی ہے۔ غیر موزونیت کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں، سہوِ کتابت یا ناواقفیتِ مرتب۔ اگر کاتب سے غلطی ہوئی تو جنابِ مرتب کو اس کی تصحیح کر دینی چاہیے تھی۔ اگر اصل ماخذ میں مصرع غلط ہے تو قوسین میں "کذا" لکھ دینا چاہیے تھا۔ بصورتِ موجودہ مبصر یا قاری یہ سوچنے میں حق بجانب ہو گا کہ فاضل مرتب ناموزوں مصرعوں کی شناخت ہی نہ کر سکے۔

نثار صاحب کی چند عروضی تصحیحات کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں:

۱۔ قطرے میں بحر کا تماشا
نقشہ ہے خدائی کا بشر میں
(تلامذۂ غالب، ص ۵۴)

نثار صاحب پہلے مصرع کی اصلاح کرتے ہیں:

قطرے میں ہے بحر کا تماشا

میں عرض کرتا ہوں کہ

"قطعے میں "بحر کا تماشا" بھی موزوں ہے مفعول فاعلن فعولن کے وزن پر۔

۲۔ مسندِ فقرا پہ زاہد نہ کرے کیونکر تکیہ
ہم فقیروں کو ہوا فضلِ خدا پہ تکیہ
(طلامذۂ غالب، ص ۱۵۷)

نثار صاحب نے اصلاح کی "مسند فقرواں"، یعنی

مسندِ فقرہ پہ زاہد نہ کرے کیونکر تکیہ

"فقرہ" یہاں بے معنی ہے نیز مصرع اب بھی غیر موزوں رہا۔ صحیح یوں ہو سکتا ہے۔

مسند فقر پہ زاہد کرے کیونکر تکیہ

۳۔ بیٹھے یوں غیر تری مسندِ کم خواب کو داب
بارِ غم کیونکر نہ ہوئے سرِ احباب کو داب
(طلامذۂ غالب، ص ۱۹۸)

نثار صاحب نے اصلاح کی کہ "کیونکر" کی جگہ "کیونکہ" چاہیے، لیکن یہاں "کیونکہ" کا مقام نہیں، "کیونکے" چاہیے۔ "کیونکر" کا مخفف "کیونکہ" نہیں، "کیونکے" ہوتا ہے۔

۴۔ تاریخِ جلوسِ آں شہِ والا قدر
آمد بلبِ خود "چراغِ دہلی"
(طلامذۂ غالب، ص ۱۰۹)

نثار صاحب نے اصلاح کی "بلبِ خود" کی جگہ "بہ لبِ خود" چاہیے۔ یہ شعر رباعی کے وزن میں ہے۔ میں نثار صاحب کی اصلاح کو نہیں سمجھ سکا، کیونکہ "بلبِ خود" کو "بہ لبِ خود" لکھ دینے سے تلفظ اور وزن میں کوئی فرق نہیں پڑتا، دونوں طرح مصرع غیر موزوں رہتا ہے۔ کلیات صہبائی میری دسترس میں نہیں۔ نہیں کہہ سکتا کہ اصل مصرع کیا تھا۔ اگر "بلبِ خود" کی جگہ "بزبانِ خود" ہو تو مصرع موزوں ہو جاتا ہے۔

۵۔ نشاط؛ دل سے پہنچے تا درِ کعبہ والے واں بھی
نشانِ یار گم پایا، پڑا تھا صاف ویرانہ
(طبعِ اول، ص ۲۹۱)

نثار صاحب لکھتے ہیں: "صحیح: نشاط ہم الخ"۔ انھوں نے یہ توجہ نہیں کی کہ اس اصلاح سے مصرع غلط در غلط ہو جائے گا، کیونکہ اس میں "ہم" کی 'م' گرے گی جو جائز نہیں "تلامذۂ غالب"۔ طبعِ دوم میں اس مصرع کو نثار صاحب کی ترمیم کے مطابق ع: "نشاط ہم دل سے پہنچے تا درِ کعبہ والے واں بھی" ہی لکھا ہے (ص ۵۳۶)۔ معلوم نہیں اصلاح کیا رہا ہو گا۔ "نشاط؛ اس دل سے الخ" ہو تو موزوں ہو جائے گا۔

۶۔ ملے یوں لطف سے کشوں کو پیرِ مے خانہ
گرے جو بوند ساغر سے، بنے تصویرِ مے خانہ
(طبعِ اول، ص ۲۹۹)

نثار صاحب نے بجا لکھا ہے کہ "ایک لفظ لطف کے بعد چاہیے"۔ طبعِ دوم، ص ۵۵۲ پر اس مصرع کو مطابقِ طبعِ اول لکھ کر بعد میں "کذا" لکھ دیا ہے۔ میرے نزدیک قیاسی تصحیح یوں ہو سکتی ہے: "ملے یوں لطف (سے) جب مے کشوں سے پیرِ مے خانہ"۔ لیکن یہ محض قیاسی ہی رہے گی۔

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے تبصرہ بڑے مفصّل مطالعے کے بعد لکھا ہے اور تسامحات کی نشان دہی بڑے احترام سے کی ہے۔

ایک اور مضمون مغیث الدین فریدی نے "تلامذۂ غالب (مالک رام) کی تاریخی غلطیاں" لکھا ہے۔ یہ "اردو تحقیق اور مالک رام" میں شامل ہے۔ لفظ "تاریخی" سے غلط فہمی ہوتی ہے کہ شاید اس میں زمانے سے متعلق سنین کی غلطیوں کی نشان دہی کی ہو گی۔ اس مضمون میں دراصل طریقِ جمل کی تاریخ کے آٹھ مصرعوں کی گرفت کی ہے۔ ان میں کچھ اغلاط کی ذمے داری "تلامذۂ غالب" کے متعلقہ مآخذ کے اندراج پر ہے۔ مالک رام نے انھیں حل کر کے نہ دیکھا ہو گا۔ ہم مختلف تحریروں میں جگہ جگہ تاریخ کے قطعات دیکھتے ہیں اور بالعموم انھیں صحیح مان لیتے ہیں، سب کا حساب نہیں

لگاتے۔ فریدی صاحب کی نشان زدہ بعض مثالیں ایسی بھی ہیں جن میں مالک رام نے تاریخ نکالی لیکن حساب میں سہو ہو گیا۔ لیکن یہ تو دیکھیے کہ کتاب میں سیکڑوں تاریخیں ہیں ان میں سے محض آٹھ فریدی صاحب کو غلط نظر آئیں۔

"تلامذۂ غالب" میں شاہ باقر علی باقر بہاری اور خواجہ میر فخرالدین حسین خان سخن کو بھی غالب کا شاگرد بتایا ہے۔ سخن نے نہ صرف غالب کو اپنا استاد بلکہ نانا بھی قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے "صحیفہ لاہور" غالب نمبر حصۂ سوم (جولائی ۱۹۶۹ء) میں ایک مضمون لکھا ، غالب کے دو جعلی شاگرد اور ایک جعلی تحریر' جس میں دعوی کیا کہ باقر اور سخن غالب کے شاگرد نہیں تھے ، نیز دیوانِ سخن پر غالب کی تقریظ وضعی تھی ، غالب کی تخلیق نہ تھی۔ مالک رام صاحب نے "تلامذۂ غالب" طبعِ دوم میں ان دونوں شاگردوں کو برقرار رکھا اور خلیق انجم کے اعتراضات کا کوئی ذکر نہ کیا۔ اس میں شک نہیں کہ غالب کے مشہور شاگردوں کے حالات میں یہ تذکرہ معلومات کا خزانہ ہے لیکن اتنے بڑے کام میں غلطیوں کے امکان کو خارج نہیں کیا جا سکتا۔

حواشی

(۱) "خاتمۂ گلِ رعنا اور سفرِ کلکتہ" مشمولہ "غالبیات اور ہم"، دہلی، ۱۹۹۳ء ، ص ۲۳۔

(۲) مالک رام : "ذکرِ غالب کچھ نئے حالات"، "افکار"، کراچی ، غالب نمبر ، ۱۹۶۹ء ص ۴۶ تا ۵۴ ، نیز "ذکرِ غالب"، طبعِ چہارم ، ص ۶۰ تا ۶۹ ، بحوالہ ابو محمد سحر ایضاً ، ص ۶۵ حاشیہ۔

(۳) نثار احمد فاروقی : "تلامذۂ غالب پر ایک نظر" مشمولہ "تلاشِ غالب"، دہلی ، ۱۹۶۹ء ص ۵۹ ۔ ۱۵۸

تیسرا باب

مضامین

مالک رام نے غالب پر بکثرت مضامین لکھے، پچاس اردو میں اور دو انگریزی میں ملتے ہیں۔ ممکن ہے، ان کے علاوہ بھی اور کچھ ہوں۔ ان میں ذیل کے تین مضامین تنقیدی ہیں:

۱۔ انسان کی خلافتِ الٰہیہ — مشمولہ "گفتارِ غالب"
۲۔ کلامِ غالب میں معاشرتی عناصر — مشمولہ "گفتارِ غالب"
۳۔ غالب اور رقیب — "نقوش" لاہور غالب نمبر حصّہ اوّل فروری ۱۹۶۹ء

ایک مضمون تخلیقی خاکہ ہے جو "میرزا غالب" کے عنوان سے پہلے مختارالدین احمد کے مرتبہ مجموعے "احوالِ غالب" میں اور پھر مالک رام کے مجموعے "وہ صورتیں الٰہی" میں شائع ہوا۔ ان کے علاوہ اردو کے بقیہ سب مضامین تحقیقی ہیں۔ میں نے ان میں وہ مضامین شامل نہیں کیے جو غالب کے ممدوحین کے احوال پر مشتمل ہیں اور جن کا موضوع غالب نہیں۔ مالک رام نے اردو کے جملہ پچاس مضامین میں سے کافی بڑی تعداد کو اپنے مجموعوں میں شامل کرلیا ہے، بہ تفصیلِ ذیل:

وہ صورتیں الٰہی ۱۹۷۴ء	۱
فسانۂ غالب ۱۹۷۷ء	۱۵
گفتارِ غالب ۱۹۸۵ء	۱۳
تحقیقی مضامین ۱۹۸۷ء	۶ غالب سے متعلق
کُل	۳۵

ان کے علاوہ ذیل کے پندرہ مضامین کی شیرازہ بندی نہیں ہوئی۔ وہ مختلف رسالوں یا دوسرے مجموعوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان میں سے دو ایک مضامین مجموعوں میں شامل دوسرے مضامین میں مدغم ہو گئے ہیں۔ یہ فہرست عرش ملسیانی کے مضمون "نگارشاتِ مالک رام" مشمولہ "ارمغانِ مالک" جلدِ اول کی مدد سے تیار کی ہے۔ عرش صاحب نے مضامین کے صحیح عنوان دینے میں احتیاط نہیں برتی۔

۳۶۔ غالب کی ایک غیر مطبوعہ تحریر — "ادبی دنیا"، ستمبر ۱۹۳۹ء

۳۷۔ غالب اور قتیل — "ادبی دنیا"، مارچ ۱۹۳۰ء

۳۸۔ غالب کی اردو خطوط نویسی کی تاریخ — جامعہ، فروری ۱۹۴۲ء

۳۹۔ مرزا غالب اور امیر مینائی — "نوائے ادب"، جنوری ۱۹۵۵ء

۴۰۔ باغِ دو در — "آج کل"، مارچ ۱۹۵۵ء

۴۱۔ غالب کا ایک شعر — "آج کل"، فروری ۱۹۵۷ء

۴۲۔ غالب کا ایک گم شدہ قصیدہ — "شاعر"، سال نامہ، ۱۹۶۰ء (یہ "تحقیقی مضامین" کے مضمون "غالب کے فارسی قصیدے" میں ضم ہے)

۴۳۔ تبصرۂ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی — "فکر و نظر"، علی گڑھ، جنوری ۱۹۶۱ء

۴۴۔ غلطی ہائے مضامیں — "یو تو"، اکتوبر ۱۹۶۲ء

۴۵۔ غالب شناسی، جب اور اب — "عیارِ غالب"، فروری ۱۹۶۹ء

۴۶۔ غالب اور رقیب — "نقوش"، غالب نمبر حصۂ اول، ۱۹۶۹ء

۴۷۔ غالب اور یوپی — "نذرِ مقبول"، جون پور، فروری ۱۹۷۰ء

۴۸۔ غالب کے نزدیک مقامِ انساں — مشمولہ بین الاقوامی غالب سیمینار، دہلی ۱۹۷۰ء کا مجموعۂ مضامین

۴۹۔ غالب کی نئی رباعی — "تحریر"، شمارہ ۳، ۱۹۷۱ء

۵۰۔ غالب کی ایک اور مہر — "تحریر"، شمارہ ۳، ۱۹۷۱ء

(یہ "فسانۂ غالب" کے مضمون "غالب کی مہریں" میں ضم ہے)

ان مضامین سے ایک مجموعہ تیار کیا جا سکتا ہے۔ مالک رام نے اپنے مجموعوں میں یہ کوتاہی کی کہ مضمون کے آخر میں اس کی نشان دہی نہیں کی کہ یہ مضمون سب سے پہلے کہاں شائع ہوا تھا۔ اپنے مضامین کے مجموعے مرتب کرتے وقت مصنفین یہ طریقہ اختیار کر لیں تو اس سے بعد کی تحقیق میں سہولت ہو۔ تاحال مالک رام کے مضامین کے محض پانچ مجموعے شائع ہوئے ہیں:

۱۔ وہ صورتیں الٰہی ۱۹۷۴ء

۲۔ فسانۂ غالب ۱۹۷۷ء

۳۔ اسلامیات ۱۹۸۴ء

۴۔ گفتارِ غالب ۱۹۸۵ء

۵۔ تحقیقی مضامین ۱۹۸۷ء

ان میں سے غالبیات کے صرف دو مجموعے ہیں "فسانۂ غالب" اور "گفتارِ غالب"۔ "وہ صورتیں الٰہی" خاکوں کا مجموعہ ہے۔ "تحقیقی مضامین" میں چھ مضامین غالب سے متعلق ہیں اور سات مضامین دوسرے موضوعات پر ہیں۔ "اسلامیات" کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اب میں ان مجموعوں میں سے غالبیات کو لیتا ہوں۔

وہ صورتیں الٰہی (۱۹۷۴ء)

مرزا غالب: یہ عجیب بات ہے کہ مالک رام صاحب کے مضامین کا پہلا مجموعہ نہ غالبیات کا ہے، نہ عام تحقیق سے متعلق بلکہ نو (۹) انشائی خاکوں کا مجموعہ ہے۔ "وہ صورتیں الٰہی" میں ان لوگوں کے خاکے ہیں جن سے مالک رام مل چکے ہیں۔ ان میں سے سب سے پہلا اور سب سے دل چسپ خاکہ "مرزا غالب" ہے۔ اس مضمون کی تاریخ یہ ہے:

یہ سب سے پہلے "علی گڑھ میگزین" غالب نمبر، جلد ۲۴، نمبر دو، ۳۹-۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ دراصل یہ شمارہ ۵۰-۱۹۳۹ء میں آیا۔ اس وقت یہ مضمون ۱۲ صفحوں کا تھا۔ نظرِثانی اور اضافوں کے بعد ۳۷ صفحات میں پھیل کر "احوالِ غالب" (۱۹۵۳ء) میں

شائع ہوا ۔ تیسری اور آخری بار مالک رام کے مجموعے " وہ صورتیں الٰہی " کی بیت الغزل بنا جہاں یہ ۳۶ صفحوں کو محیط ہے ۔ اس پر قاضی عبدالودود نے ایک صفحے کا تبصرہ لکھا جو پہلے " معاصر" پٹنہ ، حصہ ۹ میں شائع ہوا اور بعد میں " اردو تحقیق اور مالک رام" میں ۔ اس میں قاضی صاحب نے چار تسامحات کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ " وہ صورتیں الٰہی" میں شامل مضمون میں مالک رام صاحب نے اعتراض کے مقامات کی اصلاح کر لی ہے ۔

اس مضمون کو خاکہ کہیے ، کہ سوانح ، کہ انشائیہ ، لکھا گیا بہت دل چسپ اور ادبی انداز میں ہے ۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں خود کو غالب کا ہم عصر بلکہ ان کا عزیز بنا کر پیش کیا ہے ۔ دیباچے میں لکھتے ہیں :

> " آپ کہیں گے — غالب کا اس مجموعے میں شمول کیونکر جائز قرار دیا جا سکتا ہے ؟ تو اب میں آپ کو کیونکر یقین دلاؤں کہ غالب سے میری اکثر ملاقات رہی ہے اور میں نے انھیں بھی اتنے ہی قریب سے دیکھا ہے جتنا ان دوسرے بزرگوں کو جن کے حالات آپ اس کتاب میں پائیں گے ، بلکہ جسارت کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ دوسروں کی موت کے بعد ان سے ملاقات واقعی منقطع ہو گئی ، غالب سے تو آج تک جاری ہے ، حالانکہ وہ جسدی لحاظ سے ان سب سے کہیں پہلے راہی ملک بقا ہوئے تھے " ۔
>
> (دیباچہ طبع دوم ، جولائی ۱۹۸۷ء ، ص ۸)

ان پر اعتراض کیا گیا کہ خود کو غالب کا ہم عصر اور عزیز کیوں قرار دیا ۔ دراصل یہ محض ایک ادبی رمز ہے ۔ کوئی بھی واقف کار اس مغالطے میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ مالک رام کے والد غالب کے دوست اور دور کے عزیز تھے اور مالک رام غالب کے ہم عصر ۔ لیکن سو ڈیڑھ سو سال بعد اس قسم کی تحریر سے غلط فہمی ہو سکتی ہے ، بالخصوص اس صورت میں جبکہ دوسرے مضامین قرار واقعی بیانات پر مشتمل ہیں ، اس لیے مضمون کے شروع یا آخر میں یہ حاشیہ لگا دینا چاہیے کہ یہ خیالی انشائیہ ہے ۔ اس برملا اعتراف سے رمز کا لطف جاتا رہتا ، لیکن ایک ممکنہ غلط فہمی کا تو سد باب ہو جاتا ۔ اس

سے قطع نظر، یہ مضمون نہ صرف ایک کامیاب انشائیہ خاکہ ہے بلکہ عہدِ غالب کے تہذیبی ماحول کی بھی بڑی اچھی باز آفرینی کرتا ہے۔ اس کی دل آویزی کی اس سے بڑی داد کیا ہو سکتی ہے کہ اپنے تبصرے کو قاضی عبدالودود جیسے حقیقت پرست محقق نے ان الفاظ پر ختم کیا:

"اس تحریر کی دل کشی میں کلام نہیں، مگر تحقیقی مضامین کے مجموعے میں افسانے کا شمول موزوں نہیں"۔

مجموعے سے مراد "احوالِ غالب" ہے۔ علی جواد زیدی کے مرتبہ مجموعے "مالک رام ایک مطالعہ" کے دو مضمون نگاروں نے اس کی دل کھول کر داد دی ہے۔ شمس الرحمان فاروقی جیسے ناقد نظر کے مضمون کے دو حرف ملاحظہ ہوں۔

"مالک رام کے اس پورے مضمون میں وہی شان ہے جو آندرے موروا کی ان سوانح عمریوں میں ہے جن میں اس نے بعض انگریزی اور فرانسیسی ادیبوں کے حالات ناول کے طرز پر لکھے ہیں ــــ اگر محقق کا یہ بھی منصب ہے (اور یقیناً ہے) کہ وہ جس شخص یا زمانے کے بارے میں لکھ رہا ہے، اس کو ہمارے سامنے زندہ کھڑا کر دے تو یہ مضمون اعلا درجے کا تحقیقی کارنامہ ہے"۔

(سوانحِ غالب کا ایک پہلو اور مالک رام۔ مطالعہ، ص ۳۴۔ ۳۵)

اسلوب احمد انصاری کا مشاہدہ ہے:

"غالب کا جو تخیلی خاکہ اس مجموعے میں شامل ہے ــــ وہ خاصے کی چیز ہے ــــ اس خاکے میں صیغۂ واحد متکلم استعمال کر کے یہ التباس قائم کیا گیا ہے گویا لکھنے والا غالب کا ہم عصر ہے، اس طرح یہ خاکہ تخیلی تشکیل کا ایک منفرد اور نادر نمونہ بن گیا ہے ــــ یہ تصویر ہر طرح سے متناسب، موزوں اور دل موہ لینے والی ہے اور اردو مرقع نگاری کی تاریخ میں اپنی ندرت کی وجہ سے ہمیشہ یادگار رہے گی"۔

(مالک رام کی مرقع نگاری مطالعہ، ص ۴۴)

اس مضمون کو لکھنے کے لیے میں نے جو اس خاکے پر نظر ڈالی تو اس نے اس طرح کھینچا کہ پورا خاکہ لفظ بہ لفظ شروع سے آخر تک پڑھ گیا، حالانکہ اس سے پہلے بھی پڑھ چکا تھا۔ مجھے اس خاکے میں چند الفاظ اجنبی معلوم ہوئے۔ ان میں سے کچھ کے بارے میں محسوس کرتا تھا کہ وہ صحیح ہوں گے، ناواقفیت کی وجہ سے میں ان کے معنی نہیں سمجھتا، لیکن چند الفاظ کے بارے میں کھٹکتا تھا کہ شاید مالک رام صاحب نے اپنے روز مرہ کے لفظ لکھ دیے ہیں جو اردو بول چال کے خلاف ہیں۔ ایسے جملہ الفاظ درج ذیل ہیں۔ صفحے کا حوالہ "احوال غالب" طبع دوم کا ہے کہ فی الوقت "وہ صورتیں الٰہی" میرے سامنے نہیں۔

ص ۹۴ وطلے، ص ۱۰۶ اکتا چھپنی، ص ۱۰۷ لشتم پشتم، ص ۱۱۰ ٹھرے، ٹھریاں، ص ۱۱۱ دست گرداں، ص ۱۱۷ غائب غلہ، ص ۱۱۷ چرک دھانس، ص ۱۱۸ کھسل۔

میں نے انھیں "فرہنگ آصفیہ" میں تلاش کیا، پچھم کے علاوہ سب مل گئے۔ "لشتم پشتم" کے ساتھ لکھا تھا کہ نائے ہندی سے بھی ہے بلکہ عورتیں "لشتم پشتم" ہی بولتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ غالب کی زبان سے "لشتم پشتم" کہلانا بہتر ہوتا۔ کتا چھپنی، کھسل اور غائب غلہ کے الفاظ میں نے کبھی نہیں سنے تھے لیکن "آصفیہ" میں موجود ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اتنے طویل عرصے تک دہلی میں رہنے کے سبب مالک رام میں اہلِ زبان کی ادائیں پیدا ہو گئی تھیں۔ اردو خاکہ نگاری میں ان کا یہ انشائیہ ایک غیر معمولی خاکہ ہے جو تاریخ، قلمی مرقع، انشائیہ، رپورتاژ اور افسانہ، سب کے عناصر بغل میں دبائے ہوئے ہے۔ اپنے خاکوں کی وجہ سے مالک رام ایک اہم تخلیقی ادیب قرار پاتے ہیں۔

فسانۂ غالب (۱۹۷۷ء)

"وہ صورتیں الٰہی" کے بعد ان کا دوسرا مجموعۂ مضامین "فسانۂ غالب" ہے۔ اس کے پندرہ مضامین میں سے بیش تر غالب کی سوانح سے متعلق ہیں انھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ماہر غالبیات کے کیا معنی ہیں۔ ان پندرہ مضامین میں سے تیرہ کی

اشاعتِ اول کی تاریخ عرش ملسیانی کے مضمون "نگارشاتِ مالک رام" سے یوں معلوم ہو سکی:

۱۔ توقیتِ غالب	نقشِ اول در "ادبی دنیا" لاہور، جولائی ۱۹۳۲ء نقشِ ثانی در "عیارِ غالب" مرتبہ مالک رام ۱۹۴۹ء
۲۔ تاریخِ ولادت	ماخذ نامعلوم
۳۔ ایک فارسی خط کی تاریخ	"سب رس" حیدرآباد، ستمبر ۱۹۵۹ء
۴۔ میرزا یوسف	"نوائے ادب"، اپریل ۱۹۵۹ء
۵۔ عبدالصمد، استادِ غالب	"نوائے ادب"، جنوری ۱۹۵۲ء
۶۔ غالب کی مہریں	"ادبی دنیا"، اپریل ۱۹۳۱ء
۷۔ نواب شمس الدین خاں	"آج کل"، فروری ۱۹۵۶ء
۸۔ مقدمۂ پنشن کا عرضی دعویٰ	"آج کل"، فروری ۱۹۶۳ء میں بعنوان "ذکرِ غالب"
۹۔ قتیل پنجابی الاصل تھا	"نگار"، جولائی ۱۹۳۶ء، بعنوان "قتیل کا وطن"
۱۰۔ ایک معاصر اندراج	ماخذ نامعلوم
۱۱۔ سکے کا الزام اور اس کی حقیقت	"معارف"، فروری ۱۹۵۹ء
۱۲۔ غالب سے منسوب دوسرا سکہ	"معارف"، اگست ۱۹۵۹ء
۱۳۔ دربارِ رام پور سے تعلقات	"اردو"، جولائی ۱۹۵۲ء بعنوان "غالب اور دربارِ رام پور"
۱۴۔ غالب سوسائٹی	"آج کل"، مارچ ۱۹۵۸ء
۱۵۔ آزاد بنامِ غالب	"ماہِ نو" کراچی، فروری ۱۹۶۳ء

ظاہر ہے، قتیل کا مضمون غالب سے براہِ راست متعلق نہیں، لیکن وہ غالب کی زندگی کا ایک جزولاینفک بن گیا ہے۔ غالب اسے فرید آباد کا کھتری بچہ کہتے تھے۔ مالک رام نے غالب کی تصحیح کر کے قتیل کا صحیح وطن معلوم کیا، اس لیے "فسانۂ غالب" میں اس مضمون کے شمول کا جواز ہے۔ ذیل میں بیش تر مضامین پر

اپنے مشاہدات پیش کرتا ہوں ۔ ایسا کرتے وقت کالی داس گپتا رضا کا مضمون ' فسانۂ غالب ' پیشِ نظر رکھوں گا جو " مالک رام ، ایک مطالعہ " میں شامل ہے ۔

پہلا مضمون ' توقیتِ غالب ' ہے ۔ اس میں غالب کی زندگی کے واقعات اور تصانیف کی اہم اور مستند تاریخیں دی ہیں جن سے غالب کے اقارب اور بعض اہم معاصرین کی تاریخیں بھی آگئی ہیں ۔ کالی داس گپتا رضا نے بھی اپنی کتاب " دیوانِ غالب تاریخی ترتیب سے " (۱۹۸۸ء) میں ' توقیتِ غالب ' دی ہے جو نقش ثانی ہونے کی وجہ سے مالک رام کے مضمون سے زیادہ مفصّل ہے ۔ کالی داس گپتا نے " فسانۂ غالب " پر اپنے مضمون میں مالک رام کی توقیت میں حسبِ ذیل تصحیحات کی ہیں ۔

خواجہ حاجی کا انتقال سہو کتابت سے ۱۸۲۵ء ہجری میں دکھایا ہے ، عیسوی ہونا چاہیے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سنہ کے آگے قوسین میں سوالیہ نشان (؟) دیا ہے ۔ سیاح کی " لطائفِ غیبی " کی تاریخ ۱۸۶۵ء لکھی ہے ، ۱۸۶۳ء صحیح ہے ۔ غالب کی تصانیف میں " دعائے صباح " کا ذکر چھوٹ گیا ہے ۔ ایک اضافہ میں کرتا ہوں ، مئی جون ۱۸۶۳ء میں جو اندراج ہے " دیوان فارسی (کلیات نظم فارسی) کا دوسرا ایڈیشن " ۔ چونکہ اس میں دیوانِ فارسی سے کافی زیادہ کلام ہے اور کتاب کا نام " کلیات غالب " ہے ، اس لیے اسے دیوانِ فارسی کا دوسرا ایڈیشن نہیں کہا جا سکتا ۔

دوسرا مضمون ' تاریخِ ولادت ' ہے ۔ بہتر ہوتا کہ عنوان ' غالب کی تاریخِ ولادت ' ہوتا ۔ کلیاتِ غالب فارسی (طبع اول ۱۸۶۳ء ، نول کشور پریس) میں ایک منقبتی قصیدے کے ساتھ غالب کا زائچہ درج ہے جس میں ان کی تاریخِ ولادت یک شنبہ ، ہشتم رجب ۱۲۱۳ھ مطابق آغاز ۱۷۹۸ء درج ہے ۔ اس میں ۱۲۱۳ھ سہوِ کتابت ہے ۔ مولانا عرشی نے " ماہِ نو " جنوری فروری ۱۹۴۹ء میں اطلاع دی کہ اس کی ایک قدیم تر نقل کلیات کے قلمی نسخے (مرتبہ ۱۲۴۳ھ / ۱۸۳۸ء ، مخزونہ رام پور) میں ہے جہاں ۱۲۱۲ھ میں لکھا ہے ۔ غالب نے متعدد مقامات پر اپنی تاریخِ ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ھ لکھی ہے ، لیکن دقت یہ ہے کہ اس دن یک شنبہ نہیں ، چار شنبہ تھا اور یہ ہجری تاریخ آغاز ۱۷۹۸ء عیسوی میں نہیں اواخرِ ۱۷۹۷ء میں پڑتی ہے ۔

یوم و تاریخ کی مطابقت کے لیے عرشی صاحب نے "آج کل" جولائی ۱۹۶۹ء میں دعویٰ کیا کہ صحیح تاریخِ پیدائش ۸ رجب ۱۲۱۲ھ نہیں بلکہ ۱۸ رجب ۱۲۱۲ھ ہے۔ اس تاریخ کو یک شنبہ بھی تھا اور آغازِ ۱۷۹۸ء بھی۔ مالک رام صاحب نے انکشاف کیا کہ غالب نے کم از کم دو جگہ الفاظ میں اپنی تاریخ آٹھویں رجب لکھی ہے۔ اگر تحقیق میں اس طرح قیاسات کیے جائیں تو اُمن ہی اٹھ جائے گا ("فسانۂ غالب"، ص ۲۹)۔

انھوں نے نجوم سے متعلق دو مضامین کا بھی ذکر کیا۔ پہلا مضمون مسلم ضیائی کا اور دوسرا صمد حسین رضوی کا ہے۔ میں نے ان دونوں مضامین کا مطالعہ کیا۔ مسلم ضیائی کا مضمون "غالب کا زائچہ اور تاریخِ ولادت"، "اردو نامہ" کراچی، شمارہ ۲۷، مارچ ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ انھوں نے تقویم دیکھ کر ۸ رجب ۱۲۱۳ھ کے حق میں فیصلہ کیا کہ اس دن یک شنبہ تھا۔ وہ خود نجوم سے واقف نہیں، اس لیے انھوں نے پاکستان کے مشہور نجومی سید ناظر حسین شاہ زنجانی سے رجوع کیا۔ زنجانی نے علم الجفر کی رُو سے فیصلہ کیا کہ غالب کی صحیح صحیح پیدائش ۸ رجب ۱۲۱۳ھ، بروز یک شنبہ، صبح ۵ بج کر ۵۴ منٹ اور ۵۵ سیکنڈ ہے ("اردو نامہ"، ص ۵۲)۔ کراچی کے صمد حسین رضوی خود ماہرِ نجوم ہیں۔ ان کا ۳۵ صفحوں کا مضمون "غالب کی صحیح تاریخِ ولادت"، "عیارِ غالب" ۱۹۶۹ء نیز "اردو" کراچی، غالب نمبر حصۂ اول، ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ یہ بہت اصطلاحی مضمون ہے۔ انھوں نے ۸ رجب ۱۲۱۱ھ م ۸ جنوری ۱۷۹۷ء، بروز یک شنبہ، صبح ۵ بج کر ۲۶ منٹ کا حکم لگایا ("عیارِ غالب"، ص ۱۳۳، ۱۵۰)۔ انجمن ترقی اردو ہند کی تقویم ہجری و عیسوی، ایڈورڈ ماہلر کی جرمن تقویم سے ماخوذ ہے۔ رضوی نے اس کے بارے میں ایک غلط فہمی کا مفید ازالہ کیا۔ اس تقویم میں عام طور پر سلسلہ وار ایک قمری مہینا ۳۰ اور دوسرا ۲۹ دن کا فرض کر لیا گیا ہے، لیکن جیسا کہ زیج الغ بیگ میں ثابت کیا گیا ہے، حقیقی رویتِ ہلال کے مطابق کبھی دو سے لے کر پانچ مہینے تک متواتر تیس تیس دن کے ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح کبھی دو تین مہینے متواتر ۲۹ دن کے ہو سکتے ہیں، اس لیے ماہلر اور انجمن کی تقویم کے مطابق معلوم کی ہوئی ہجری تاریخ میں ایک دو اور کبھی تین دن تک کا فرق پڑ سکتا ہے۔ اس لیے جو حضرات کسی تحقیقی کام کے لیے

اس تقویم کو حرفِ آخر سمجھ لیتے ہیں ، وہ بہت بڑی غلطی کرتے ہیں (ص ۱۳۶)۔ اس موضوع پر حرفِ آخر ڈاکٹر حنیف احمد نقوی کا بہت طویل ، بہت بالاستیعاب اور بہت مدلل مضمون ' غالب کا سالِ ولادت ' ہے جو پہلے " غالب نامہ " دہلی جنوری ۱۹۸۵ء میں اور پھر ان کے مجموعے " غالب ، احوال و آثار " (لکھنؤ ، ۱۹۹۰ء) میں شائع ہوا۔ اسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق کسے کہتے ہیں ۔ انھوں نے مختلف سنین کے بارے میں موافق و مخالف ، جملہ بیانات کا تجزیہ کر کے طے کیا کہ غالب ۸ رجب ۱۲۰۸ھ کو پیدا ہوئے تھے ۔ ان کی دانستہ غلط بیانی کی محرک مقدمۂ پنشن کی ضروریات تھیں (احوال و آثار ، ص ۵۰)۔

تیسرا مضمون ایک فارسی خط سے متعلق ہے جس میں تاریخِ کتابت ۱۸۰۳ء دی ہے۔ خط کیا ہے ، ایک طرح کی دستاویز ہے جو قرض وغیرہ سے متعلق ہے اور جس میں اپنی والدہ کی شدید بیماری کا ذکر کیا ہے ۔ ظاہر ہے ۱۸۰۳ء میں ، یعنی چھ سات سال کی عمر میں غالب یہ فارسی دستاویز نہیں لکھ سکتے تھے ۔ حالات کا جائزہ لے کر مالک رام صاحب نے طے کیا کہ یہ دراصل ۱۸۳۰ء ہے ، ۱۸۰۳ء نہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی والدہ اس وقت تک زندہ تھیں ۔ چونکہ یہ نتیجہ محض ایک قیاس ہے ، اس لیے میں اسے قطعی طور پر نہیں مان سکتا ، ممکنہ ہی کے زمرے میں رکھوں گا ۔

چوتھا مضمون ' میرزا یوسف ' ان کے بھائی کے بارے میں ہے ۔ اس کے لیے انھوں نے قومی آرکائوز میں دو مسلیں تلاش کر کے مرزا یوسف کی بیوہ کا نام ، ان کی درخواستِ وظیفہ اور اس پر مختلف عہدے داروں کی کارگزاری کی تفصیلات معلوم کیں ۔ " دستنبو " میں غالب نے لکھا ہے کہ مرزا یوسف بخار سے مرے ، لیکن مالک رام نے تحقیق کر کے ثابت کیا کہ وہ دورانِ غدر گھر سے نکلنے پر انگریز سپاہیوں کی گولی کا نشانہ بنے ۔

پانچواں مضمون ' عبدالصمد ، استادِ غالب ' ہے ۔ قاضی عبدالودود نے " علی گڑھ میگزین " ۱۹۴۸ - ۴۹ ، میں ایک مضمون ' غالب کا ایک فرضی استاد ' لکھا جس میں عبدالصمد کے وجود خارجی سے انکار کیا ۔ مالک رام نے " نوائے ادب " جنوری ۱۹۵۲ء

میں اپنے مضمون "عبدالصمد، استادِ غالب" میں نہ صرف عبدالصمد کی ہستی پر اصرار کیا بلکہ قاضی عبدالودود کے دلائل کا جواب بھی دیا۔ قاضی صاحب نے "احوالِ غالب" میں شامل کرنے کے لیے اپنے مضمون میں اتنی ترمیم کی کہ بقولِ مرتبِ "احوالِ غالب": "قاضی عبدالودود صاحب نے عبدالصمد پر گویا نئے سرے سے دوسرا مضمون ہی لکھ ڈالا ہے"۔ انھوں نے اس بار مضمون کا عنوان "ہرمزد ثم عبدالصمد" کر دیا۔ مضمون کے آخر میں ایک طویل استدراک لکھ کر مالک رام صاحب کے دلائل کا جواب الجواب دیا۔ اس میں انھوں نے یہ جملہ بھی لکھ دیا:

"اس کے ساتھ ساتھ اگر وہ یہ بھی لکھ دیتے کہ حالی و شیفتہ نے عبدالصمد سے ملاقات بھی کی تھی تو میں ان کا کچھ بگاڑ نہ سکتا"۔

(احوالِ غالب، طبع دوم، ۲۵۱ ۔ ۲۲۳)

مالک رام صاحب نے "فسانۂ غالب" میں اپنا مضمون شامل کرتے وقت اس پر نظرِثانی کی، چنانچہ وہاں قاضی صاحب مندرجۂ بالا ریمارک نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"مجھے واقعی سخت حیرت ہے کہ انھوں نے ایک سنجیدہ گفتگو میں یہ لہجہ اختیار کیا"۔

(فسانۂ غالب، ص ۷۶)

مالک رام نے قاضی صاحب کی اس درشت کلامی پر تو احتجاج کیا لیکن اس سے بھی زیادہ سخت حملے کو نظر انداز کر دیا۔ قاضی صاحب نے "احوالِ غالب" میں استدراک کے بعد تصحیح و اضافہ لکھا ہے اور پھر حواشی میں بھی ترمیم کی ہے۔ حاشیہ ۱۹ کے بارے میں اضافہ کرتے ہیں:

"نامحتاط مصنف بالارادہ ایسی باتیں بڑھا دیا کرتے ہیں جن کا کوئی ثبوت ان کے پاس نہیں ہوتا۔ اس کی ایک مثال جناب مالک رام کی یہ عبارت ہے جو "ذکرِ غالب" (اشاعت ۲)، صفحہ ۲۵ میں ہے:

"عبدالصمد اسلام قبول کرنے سے پہلے زردشتی مذہب کے موبد (کذا) تھے"۔ (ص ۲۴۸)

اس میں انھوں نے مالک رام پر کئی الزامات لگائے ہیں:

۱۔ وہ نامحتاط مصنف ہیں۔

۲۔ بالارادہ ایسی باتیں اضافہ کر دیتے ہیں جن کا کوئی ثبوت ان کے پاس نہیں ہوتا۔

۳۔ ایسی ایک مثال عبدالصمد کو پارسیوں کا موبد لکھنا ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں۔

۴۔ وہ موبد کا صحیح تلفظ نہیں جانتے، چنانچہ اس لفظ کو فتح اول سے لکھا ہے۔

واضح ہو کہ "ذکرِ غالب" طبع پنجم میں یہ جملہ اس طرح ملتا ہے:

"اسلام قبول کرنے سے قبل وہ زردشتی مذہب کے پیرو تھے"۔ (ص ۲۳، سطر ۱۵)

اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ "فسانۂ غالب" کی ترتیب سے پہلے قاضی صاحب کے اعتراض کو دیکھ چکے تھے جس کے تحت انھوں نے موبد کو بدل کر پیرو کر دیا۔ لیکن "فسانۂ غالب" کے مضمون میں قاضی صاحب کی گرفت کو پی گئے۔ میرے استفسار پر کالی داس گپتا رضا نے "قاطع برہان" دیکھ کر مجھے لکھا کہ غالب نے کہیں عبدالصمد کو موبد نہیں لکھا (مکتوب مورخہ ۹ ستمبر ۱۹۹۳ء) اس کے معنی، یہ مالک رام کا اضافہ تھا۔ موبد کو فتح اول سے انھوں نے لکھا تھا یا کاتب نے، کہا نہیں جا سکتا۔ "غیاث اللغات" میں اس لفظ کا تلفظ ضم اول و واو معروف سے ہے، لیکن یہ بھی لکھا ہے کہ موید و سروری و جہانگیری میں بہ فتح اول ہے۔ میرے استفسار پر کالی داس گپتا رضا نے مجھے لکھا:

"فرہنگ معین، قاضی صاحب کے نزدیک تا حال 'معتبر ترین لغت' تھا۔ اس میں مُوبد اور موبد دونوں ہیں مگر مُوبَد کو ترجیح معلوم ہوتی ہے۔ اس نے انگریزی میں یوں لکھا ہے: maubad-mu دونوں کا ذکر کر کے مُوبَد کو ترجیح دیجیے"۔

(مکتوب مورخہ ۲۱ اگست ۱۹۹۳ء)

یہ دھیان دینے کے قابل ہے کہ قاضی صاحب کی نازیبا تعریضات کے مقابلے میں مالک رام کا لہجہ ہر جگہ پُراحترام رہا ہے۔ وہ انھیں قاضی صاحب محترم، جناب قاضی صاحب، جناب قاضی صاحب قبلہ لکھتے ہیں۔ کاش قاضی صاحب تحریر و تقریر میں

آداب شرافت کی طرف بھی کچھ توجہ کرتے!

میں نے زیرِ نظر مضمون لکھتے وقت ایک بار پھر قاضی صاحب کا مضمون پڑھا اور ان کے دلائل کو ماننے پر مائل ہوا۔ پھر مالک رام صاحب کا مضمون پڑھا۔ انھوں نے قاضی صاحب کے اعتراضات کی جس قانونی انداز میں تردید کی ہے، ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مالک رام نے حالی کے اس جملے کو اپنی دلیل قاطع قرار دیا ہے جس میں سب کچھ لکھنے کے بعد یہ فیصلہ درج کیا:

"عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی سیکھی تھی"۔

("یادگار غالب"، غالب انسٹیٹیوٹ ایڈیشن ۱۹۸۶ء، ص ۱۳)

دوسری دلیل شیفتہ کی یہ شہادت ہے کہ ملا عبدالصمد نے غالب کو خط لکھا تھا۔ تیسری دلیل "فسانۂ غالب" میں نہیں دی، "ذکرِ غالب" میں ہے۔

نواب علائی لکھتے ہیں:

"عبدالصمد تاجر تھا۔ ذخائر کے لیے آگرے کو اس نے امید گاہ بنایا تھا"۔ (۱)

("نگار" رام پور، فروری ۱۹۴۹ء، بحوالہ "ذکر غالب"، طبع پنجم، حاشیہ ص ۳۳)

حالی و شیفتہ غیر ثقہ راوی نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

"ملا عبدالصمد (ہرمزد۔ استاد غالب) غیر معمولی علم و استعداد کا شخص تھا ــــ عبدالصمد پر سنسکرت اور قدیم فارسی کے باہمی رشتے کا راز کھل چکا تھا"۔

اوم پرکاش بجاج بتاتے ہیں کہ مولانا حالی، نیولانا مہر اور شیخ اکرام، ملا عبدالصمد کے وجود کے قائل ہیں جبکہ قاضی عبدالودود اور مولانا عرشی قائل نہیں۔

مولانا عرشی نے نسخۂ عرشی کے مقدمے میں عبدالصمد کی شخصیت کو سراسر افسانہ قرار دیا ہے (طبع اول ۱۹۵۸ء، ص ۷)۔ "مالک رام، ایک مطالعہ" کے دو مضمون نگار مالک رام کے موقف اور عبدالصمد کے وجود کو ماننے پر مائل ہیں۔ شمس الرحمان فاروقی نے اپنے مضمون میں اس موضوع کو ساڑھے آٹھ صفحے دیے ہیں، جن کا آخری جملہ یہ ہے:

ہے:

"مجموعی طور پر ان (مالک رام) کا فیصلہ اس وقت تک کی معلومات اور فکر کی روشنی میں صحیح ہے"۔ (ص ۱۳۱)

اگر فاروقی کو محض نقاد کہہ کر ان کی رائے کو کم اہمیت دی جائے تو کالی داس گپتا رضا جیسے سرآمد ماہرین غالبیات کی یہ رائے دیکھیے:

"میری رائے میں حالی کے مندرجہ بالا بیان اور شیفتہ کے حوالے سے دیے ہوئے فارسی خط (ملا عبدالصمد بنام غالب) کو محض کذب کی تائید کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں کوئی سچائی ضرور ہے"۔ (مطالعہ ص ۳۶)

واضح ہو کہ کالی داس گپتا، قاضی عبدالودود اور مالک رام دونوں کے معتقد علیہ ہیں۔ میں حالی اور مالک رام کے موقف سے اتفاق کرتا ہوں۔

اگلا مضمون 'غالب کی مہریں' ہے۔ یہ اصلاً "ادبی دنیا" اپریل ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ اس میں عربی کے شعر والی ایک مہر کو بھی ان سے منسوب کیا تھا۔ اس کے بعد رسالہ "تحریر" جلد ۵، شمارہ ۱۹۷۱ء میں ایک مضمون 'غالب کی چھٹی مہر' لکھا جس میں تصحیح کی کہ عربی کے شعر والی مہر کسی حکیم صاحب کی ہے۔ اس مہر کو خارج کر کے ایک نئی مہر کا تعارف کرایا۔ "فسانۂ غالب" کے مضمون میں "تحریر" کے اس مختصر مضمون کو ضم کر لیا ہے۔ مضمون کا سب سے قابلِ قدر پہلو ان مہروں کا نفسیاتی مطالعہ ہے۔

ساتواں مضمون نواب شمس الدین احمد خان کے بارے میں ہے۔ اس میں نواب سے متعلق بیش بہا تفصیلات جمع کر دی ہیں۔ اس کے ماخذ میں "مرقع الور" اور "کارنامۂ سروری" جیسی غیر معروف کتابوں کے علاوہ قومی آرکائوز کے متعدد مراسلات شامل ہیں۔ اس طرح اس مضمون میں فریزر سے متعلق جتنی مستند اور مفصل معلومات جمع کر دی گئی ہیں، اتنی خود ان کی کتاب "ذکرِ غالب" میں بھی نہیں۔

آٹھواں مضمون 'مقدمۂ پنشن کا عرضی دعویٰ' ہے۔ "آج کل" فروری ۱۹۶۳ء

میں اسی موضوع پر ان کا مضمون "ذکر غالب" شائع ہوا تھا، غالباً یہی مضمون تھا۔ ابھی تک مالک رام یا کسی کو بھی غالب کی پہلی درخواست یعنی عرضی دعویٰ دست یاب نہیں ہوا تھا۔ مالک رام لندن گئے تو انڈیا آفس لائبریری میں غالب سے متعلق تمام کاغذات نکلوائے۔ انھیں میں غالب کے عرضی دعوے کی طویل روداد مل گئی۔ اس میں ۲۰ دفعات ہیں۔ اس درخواست کے اہم تر مطالب "ذکرِ غالب" میں شامل کر لیے گئے ہیں جن سے غالب کی نوجوانی کے بہت سے واقعات معلوم ہوتے ہیں۔

نواں مضمون 'قتیل پنجابی الاصل تھا' کے عنوان سے ہے۔ اصلاً یہ "نگار" جولائی ۱۹۳۳ء میں 'قتیل کا وطن' کے نام سے شائع ہوا۔ مالک رام نے قطعی طور پر معلوم کیا کہ قتیل پنجاب کے شہر بٹالہ کے ایک خاندان سے تعلق رکھتا تھا، فرید آباد سے نہیں۔ مختلف مقامات پر جستجو کر کے مالک رام نے جس طرح قتیل کے شجرے اور اعزا کی نشان دہی کی ہے، وہ قابلِ داد ہے۔ انھوں نے قتیل کا صحیح نام دیوانی سنگھ بھنڈاری بھی معلوم کیا۔

دسواں مضمون ' ایک معاصر اندراج ' ہے جس میں آغا تجو شرف کی مثنوی "شکوہ فرنگ" کے مخطوطہ لندن میں سے غالب کے متعلق اشعار درج کیے اور دو دعوے کیے:

۱۔ یہ غالب سے متعلق غیر مطبوعہ اندراج ہے۔

۲۔ غالب کے بارے میں معاصر لکھنوی اہل قلم کی تحریریں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس سے پہلے صرف خواجہ عزیز لکھنوی کی میرزا سے مختصر ملاقات کا ذکر ملتا ہے (فسانہ، ص ۱۳۶)۔

میرے سامنے "فسانۂ غالب" کی اپنی جلد کے علاوہ کاظم علی خاں کی ذاتی جلد بھی ہے۔ انھوں نے اپنی جلد کے آخر میں نوٹ لکھا ہے کہ "فسانۂ غالب" سے پہلے "شکوہ فرنگ" پاکستان میں دوبار شائع ہو چکی ہے، اس لیے اسے غیر مطبوعہ اندراج نہیں کہہ سکتے۔ دوسرے یہ کہ معاصر لکھنوی مصنفین کی غالب سے متعلق کئی تحریریں ملتی ہیں، مثلاً "تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا" مؤلفہ سعادت خاں ناصر، محسن کا تذکرہ

"سراپا سخن"، نیز "اودھ اخبار" جس کے متعدد شماروں میں غالب یا ان کے ادبی آثار کا ذکر موجود ہے۔

گیارھواں مضمون "سکے کا الزام اور اس کی حقیقت" ہے۔ ایک مخبر گوری شنکر نے غالب پر الزام لگایا تھا کہ انھوں نے ۱۸ جولائی ۱۸۵۷ء کو سکے کا یہ شعر کہا۔

بزر زد سکۂ کشور ستانی
سراج الدین بہادر شاہ ثانی

غالب جانتے تھے کہ یہ ان کا شعر نہیں ہے۔ وہ دنیا بھر سے مدد مانگتے رہے کہ اخباروں کو کھنگال کر اس کے خالق کا نام معلوم کر دیں، کوئی نہ بتا سکا۔ غالب کی زندگی کے بہت بعد حسنِ اتفاق سے مالک رام صاحب نے قومی دفتر خانۂ ہند دہلی میں "صادق الاخبار" میں اس شعر کو کھوج نکالا۔ یہ حافظ ویران کا شعر ہے۔ مالک رام کی یہ دریافت اسی نوعیت کی ہے جیسے لندن سے عرضی دعوے کی درخواست ڈھونڈ نکالنا۔

اگلا مضمون "غالب سے منسوب دوسرا سکہ" ہے۔ اس میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے ایک اور شعر، نیز ڈاکٹر خلیق انجم نے اس سے مختلف شعر لکھ کر دعویٰ کیا کہ غالب پر دو سکے کہنے کا الزام تھا۔ مالک رام نے تصحیح کی کہ محض ایک ہی سکے کا الزام تھا، دو کا نہیں۔ اس سلسلے میں ایک قول کے سلسلے میں خلیق صاحب نے لکھا تھا۔

"غالب ایسے معاملوں میں مستقل دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں"۔
(غالب اور شاہانِ تیموریہ، ص ۱۱۰)

آج کل "جھوٹ بولنے کا الزام" ہمارے پارلیمنٹ کے آداب کے خلاف ہے (unparliamentary word)۔ مالک رام اپنے ہیرو پر اس الزام کو برداشت نہ کر سکے بھڑک گئے۔ تلقین کرتے ہیں:

"درشت کلامی اور سخت زبانی اور استہزا نہ دلیل و حجت کی جگہ لے سکتے ہیں نہ اسے تقویت پہنچا سکتے ہیں۔ ہماری غالب کے خلاف یہی تو شکایت ہے کہ انھوں نے مؤلف برہانِ قاطع کے لیے تمسخر اور توہین کا لہجہ اختیار کیا"۔ ص ۱۴۳)

چونکہ مالک رام خود درشت کلامی، سخت زبانی اور استہزا کا شکار رہے ہیں، اس لیے وہ شاید بالواسطہ اپنے معترضین کو خطاب کر رہے ہیں۔ کاش ادبی بحثیں کرنے والے محقق اور نقاد اس بزرگانہ نصیحت کو حرزِ جان بنا لیں! لیکن غالب کو دروغ گو کہنے والے صرف خلیق انجم ہی نہیں۔ ڈاکٹر حنیف احمد نقوی کے یہ مشاہدات باعث دلچسپی ہو سکتے ہیں:

"(غالب) صادق القول ہرگز نہیں تھے اور مصلحت کے حدود سے آگے بڑھ کر صرف بطورِ تفریح جھوٹ بولنے میں بھی مطلق تامل نہیں کرتے تھے ــــ یہ تسلیم کر لینے سے بھی کہ جھوٹ بولنا ان کی عادت میں داخل تھا، ان کی قدر و منزلت یقیناً متاثر نہ ہوگی ــــ غالب کا حافظہ انتہائی کمزور اور ناقابلِ اعتبار تھا۔ انھیں مطلق یہ یاد نہ رہتا تھا کہ کسی خاص معاملے میں کچھ دنوں پہلے کسی شخص کو کیا لکھ چکے ہیں اور آج کسی دوسرے شخص کو کیا لکھ رہے ہیں، یا کل کسی شخص کو کسی سلسلے میں کیا کہا تھا اور آج کیا گفتگو کر رہے ہیں"۔

(غالب، احوال و آثار، ص ۲۲)

تیرھواں مضمون 'دربارِ رام پور سے تعلقات' ایک بھرپور معلوماتی مضمون ہے۔ اس کا زیادہ تر مواد مولانا عرشی کی "مکاتیبِ غالب" سے ماخوذ ہے۔

چودھواں مضمون 'غالب سوسائٹی' غالب کی سوانح سے متعلق نہیں۔ اس میں غالب کے انتقال کے بعد ان کی یادگاریں قائم کرنے کی تاریخ ہے جن میں ۱۹۵۳ء میں قائم شدہ غالب سوسائٹی کی روداد دی ہے۔ آخری مضمون 'آزاد بنام غالب' میں "آبِ حیات" میں غالب پر کیے گئے بعض اعتراضات کا ذکر اور ان کی صفائی دی ہے۔

اس مجموعے کے چار پانچ مضامین کو چھوڑ کر بقیہ سب غالب کی داستانِ حیات کے بارے میں مفید معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ غرض یہ کہ یہ کتاب "ذکرِ غالب" کا تتمہ ہے۔ بعض امور جو "ذکرِ غالب" میں مجمل ہیں، یہاں مفصل ہیں۔

گفتارِ غالب (۱۹۸۵ء)

غالبیات پر مضامین کا دوسرا مجموعہ "گفتارِ غالب" ہے۔ اس میں مصنف کے مقدمے پر بھی اگست ۱۹۸۵ء کی تاریخ پڑی ہے اور ناشر مکتبۂ جامعہ نے بھی اشاعت کی تاریخ یہی درج کی ہے۔ مالک رام صاحب نے مجھے یہ مجموعہ ۳ فروری ۱۹۸۶ء کو بھیجا جس سے میں قیاس کرتا ہوں کہ اس کی واقعی اشاعت اوائل ۱۹۸۶ء میں ہوئی۔ "گفتارِ غالب" ایک اہم دیباچے اور تیرہ مضامین پر مشتمل ہے۔ ان کی فہرست اور اولین اشاعت کی تفصیل یہ ہے:

پیش گفتار	"عیارِ غالب" ۱۹۶۹ء میں بعنوان "غالب شناسی جب اور اب"
۱۔ میر اور غالب	اوّلین اشاعت نامعلوم
۲۔ انسان کی خلافت الٰہیہ	بین الاقوامی غالب سیمینار ۱۹۷۰ء میں بعنوان "غالب کے نزدیک مقامِ انسان"
۳۔ کلامِ غالب میں معاشرتی عناصر	"نذرِ حمید"، ۱۹۸۱ء
۴۔ ذوق اور غالب	"نگار" ستمبر ۱۹۳۶ء میں بعنوان "غالب اور ذوق"
۵۔ گلِ رعنا (سبزۂ اردو)	"نذرِ ذاکر"، ۱۹۶۸ء میں بعنوان "گلِ رعنا" (غالب کا گم شدہ انتخابِ کلام)
۶۔ گلِ رعنا (سبزۂ فارسی)	"نگار"، جولائی ۱۹۶۰ء
۷۔ دیوانِ اردو کی کہانی	اوّلین اشاعت نامعلوم
۸۔ چراغِ دیر	اوّلین اشاعت نامعلوم
۹۔ غالب کی فارسی تصانیف	"نگار"، جولائی ۱۹۶۰ء
۱۰۔ دعاے صباح	ارمغانِ الفت دلی ۱۹۶۳ء میں جو خواجہ غلام السدین کو پیش کیا گیا۔ وہاں بعنوان "دعاء الصباح"

۱۱۔ سوالاتِ عبدالکریم — "آج کل"، فروری ۱۹۵۳ء

۱۲۔ احسان، غالب، ذکا — "تحریر"، شمارہ ۱۲ (جلد ۳، شمارہ ۴)

۱۳۔ غالب اور تنافر — اوّلین اشاعت نامعلوم

اس طرح چار مضامین کے بارے میں علم نہیں کہ وہ پہلے کہیں شائع ہوئے کہ نہیں۔ سب سے عجیب معاملہ "پیش گفتار" کا ہے۔ "عیارِ غالب" میں ان کا مضمون "غالب شناسی، جب اور اب" شامل ہے۔ اسی مضمون کو "گفتارِ غالب" کا دیباچہ بعنوان "پیش گفتار" بنا لیا گیا ہے۔ "عیارِ غالب" کے مضمون کے آخر میں دو صفحوں میں غالب کے اشعار تھے، انھیں حذف کر کے زیرِ نظر مجموعے میں دو مزید نثری صفحے لکھ دیے ہیں۔

اس پُرمغز پیش گفتار میں انھوں نے یہ غلط فہمی دور کی ہے کہ اپنی زندگی میں غالب کی کوئی قدر نہیں ہوئی۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ غالب دہلی کے بادشاہ ظفر اور رام پور کے نواب یوسف علی خاں دونوں کے استاد تھے۔ دہلی کے تمام عالموں اور ادیبوں سے ان کے مساویانہ مراسم تھے۔ ان کی تمام تصانیف ان کی زندگی میں نہ صرف شائع ہوئیں بلکہ بعض کے کئی کئی ایڈیشن نکلے۔ اردو دیوان پانچ بار شائع ہوا، استادِ شاہ شیخ ذوق کی زندگی میں ان کے دیوان کو ایک بار بھی طباعت کا منھ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ دیوانِ مومن محض ایک بار شائع ہوا۔ غالب کے اردو فارسی خطوط تک کے مجموعے ان کی زندگی میں چھپ گئے۔ یہ اعزاز اور کس کو ملا تھا؟ غالب کی دو روغنی تصویریں اور ایک فوٹو ملتا ہے۔ ان کے ہم عصروں میں کتنوں کی معتبر تصویریں ہیں؟ مالک رام انکشاف کرتے ہیں:

> "آج مختلف اساتذہ کی جو تصویریں متداول ہیں، یہ سب جعلی ہیں۔ ان میں سے بیش تر بھوپالی مصور محمد اویا کی بنائی ہیں"۔
>
> (گفتارِ غالب، ص ۱۷)

مالک رام صاحب کو محض محقق سمجھا جاتا ہے، لیکن اس کتاب میں انھوں نے اپنی تنقیدی نظر کا وافر ثبوت دیا ہے۔ دیباچے میں کہتے ہیں کہ "اردو میں دو شاعر ایسے ہیں

جن کے کلام میں اپنی مخصوص فضا ہے۔ میر اور غالب "۔ ظاہر ہے کہ مالک رام محض قدیم اساتذہ کی بات کر رہے تھے، اقبال، جوش یا فراق وغیرہ کی نہیں۔ غالب کے لیے لکھتے ہیں:

" غالب کی دنیا نشاط اور ولولے، غور و فکر، ہمت اور جرأت کی دنیا ہے اس سے آپ کو آزادیٔ رائے اور آگے بڑھنے کا سبق ملتا ہے۔ اس کے کلام میں حرکت ہے، نشاط ہے، ولولہ ہے ــــ آپ کے دل میں طرح طرح کے سوال پیدا ہونے لگتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جتنے سوالات خود غالب نے اپنے کلام میں خدا اور خدا کے بندوں اور خود اپنے آپ سے پوچھے ہیں، اتنے شاید ہی کسی اور شاعر نے دریافت کیے ہوں گے۔ اس صفت کو ہم ' فکر انگیز ' کہہ سکتے ہیں "۔ (ص ۱۴ - ۱۵)

اب مضامین پر ایک نظر۔ پہلے مضمون " میر اور غالب " میں یہ غلط فہمی دور کی ہے، کہ غالب ابتدا میں دقیق انداز میں لکھتے تھے، بعد میں میر کے سہل انداز میں لکھنے لگے۔ فاضل مضمون نگار نے بتایا ہے کہ سہل انداز کی ۳۵ غزلیں ۱۸۲۶ء سے پہلے کی ہیں (ص ۳۱)۔ دوسرے مضمون " انسان کی خلافتِ الٰہیہ " میں غالب کے فارسی اور اردو اشعار سے ثابت کیا ہے کہ غالب کی نظر میں انسان دنیا میں خلیفۂ الٰہی اور خلاصۂ کائنات ہے۔ اقبال کی مشہور فارسی نظم " خدا اور انسان کا مکالمہ " (ــــ چراغ آفریدم) سے پہلے غالب نے اعلان کیا تھا:

زما گرمست ایں ہنگامہ، بنگر شورِ ہستی را
قیامت می دمد از پردۂ خاکی کہ انساں شد

" کلامِ غالب میں معاشرتی عناصر " ایک اچھوتا تنقیدی مضمون ہے۔ اس انداز کا تجزیہ پہلے کہیں دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ اس میں غالب کے کلام سے معاشرتی آداب شرفا کے اصول، سامانِ خورد و نوش، میلے، تیوہار، توہمات، پیشے وغیرہ سے متعلق بیانات درج کیے ہیں، مثلاً اس زمانے میں جب کوئی شخص کسی سے رخصت ہوتا تھا تو اسے

اپنی یاد دلانے کے لیے کوئی تحفہ دے دیتا تھا۔ ان میں سب سے مقبول شے تھی چھلا جو اکثر نظروں کے سامنے آتا رہتا ہے:

کافی ہے نشانی تری چھلّے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے ، بوقتِ سفر ، انگشت
(ص ۴۴)

اسی طرح مصنف کے جھول بازار میں علیک سلیک کے علاوہ طویل گفتگو کا بالکل رواج نہ تھا۔ ناقدین حدیث نے لکھا ہے کہ کوئی شخص بازار میں کھڑا کھا رہا ہو تو اس کی روایت کردہ حدیث پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ غالب اس شعار کا فائدہ اٹھا کر کہتے ہیں:

کچھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہیے کہ سرِ رہگزر ہے ، کیا کہیے
(ص ۴۹)

ظفر کے دربار کے یہ آداب تھے کہ درباری ایک دوسرے سے ملنے پر سلام کے لیے اپنے ہاتھ پیشانی کے بجائے کان تک لے جاتے تھے ، اس کی غالب نے یہ لطیف توجیہ کی:

کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام
اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں
(ص ۵۰)

"ذوق اور غالب" ایک اور تنقیدی مضمون ہے۔ مالک رام ماہر غالبیات ہیں ، توقع تھی کہ وہ غالب کے طرف دار ہوں گے ، لیکن اس مضمون میں انھوں نے ذوق اور غالب کے ہم معنی اشعار کا بڑی معروضیت سے موازنہ کیا ہے اور اکثر صورتوں میں ذوق کے اشعار کو ترجیح دی ہے۔ "ارمغانِ مالک" دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ مضمون ستمبر ۱۹۲۶ء کا ہے اور اسی سے ان کی غالب سے دل چسپی کی ابتدا ہوئی۔ کلامِ غالب کے ابتدائی انتخاب "گلِ رعنا" سے متعلق دو مضامین ہیں۔ یہ انتخاب گم ہو گیا تھا۔ مالک رام کو سب سے پہلے اس کا نسخہ ۱۹۵۷ء میں ملا۔ انھوں نے اسے شائع تو کیا ۱۹۷۰ء

ہیں لیکن اس سے پہلے دو مضامین میں اس کے مشمولات کا تعارف کرایا، ایک میں اردو حصے کا، دوسرے میں فارسی کا۔ پہلا مضمون "نذرِ ذاکر" (۱۹۶۸ء) میں 'گلِ رعنا' (غالب کا گم شدہ انتخابِ کلام) کے نام سے چھپا۔ "نذرِ ذاکر" دس سال پہلے ہی سے زیرِ ترتیب تھی۔ مالک رام نے یہ مضمون اپریل ۱۹۵۸ء سے پہلے لکھا جو "نذرِ ذاکر" میں ۱۹۶۸ء میں سامنے آیا (مقدمۂ گلِ رعنا، ص ۱۳)۔ "گفتارِ غالب" میں اس کا نام 'گلِ رعنا بہرۂ اردو' ہے۔

جب "نذرِ ذاکر" میں یہ مضمون چھپا، اس کی بہت اہمیت تھی کیونکہ اس وقت تک "گلِ رعنا" شائع نہیں ہوئی تھی۔ "گلِ رعنا" کی اشاعت کے بعد اس مضمون کی اہمیت محض تاریخی رہ گئی ہے، معلوماتی نہیں۔ فارسی حصے سے متعلق مضمون "نگار" جولائی ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ یہ 'بہرۂ اردو' کے بعد لکھا گیا لیکن شائع اس سے پہلے ہوا۔ دونوں مضامین میں بعض اشعار کے "گلِ رعنا" میں شامل متن اور بعد کے مجموعوں میں ترمیم شدہ متن کی نشان دہی کی ہے نیز بہت سی نظموں اور غزلوں کا زمانی مطالعہ کیا ہے۔

"دیوانِ اردو کی کہانی" ۳۷ صفحوں کا تنقیدی مضمون ہے اور میرے نزدیک اس مجموعے کی بیت الغزل ہے۔ یہ اور معاشرتی عناصر والا مضمون اس مجموعے کے سب سے دل چسپ اور معلومات افروز مقالے ہیں۔ تحقیق میں کس طرح افسانوی دل چسپی پیدا کی جا سکتی ہے، یہ "دیوانِ اردو کی کہانی" میں دیکھیے۔ اس کی ابتدا میں یہ بحث ہے کہ غالب نے شعر گوئی کا آغاز کب کیا۔ اس کے بعد ان کے مرتبہ قلمی مجموعوں انتخابات، دیوان کے مختلف ایڈیشنوں اور بیسویں صدی کے بعض مطبوعہ متون کی تفصیل ہے۔ ہر چیز آئینہ ہو کر سامنے آجاتی ہے، ہر موضوع کے ابعاد سے پوری واقفیت ہو جاتی ہے۔ "دیوانِ غالب" بخط غالب کی بحث خاص طور سے دل چسپ ہے۔ اس سے یہ انکشاف ہوا کہ مالک رام نے توفیق احمد کو اس نسخے کے لیے دس ہزار روپے پیش کیے لیکن وہ راضی نہ ہوا (ص ۱۳۲)۔ مالک رام کا ایک اور اہم مفروضہ یہ ہے کہ اس دیوان سے پہلے بھی کوئی غیر مردف بیاض یا دیوان رہا ہو گا، نیز اس

بخطِ غالب دیوان کی ایک اور نقل تیار کی گئی ہو گی ۔ ان قیاسات کے دلائل ضعیف نہیں (ص ۱۵۳۔۱۵۱)۔

موجودہ دیوان منتخب ہے ۔ آزاد نے " آب حیات " میں لکھا ہے کہ انتخاب کا کام مولوی فضل حق اور مرزا خان عرف مرزا خانی کوتوالِ شہر نے کیا ۔ مالک رام اسے افسانہ طرازی قرار دیتے ہیں ۔ لکھتے ہیں کہ مولوی فضلِ حق کا علم و فضل مسلّم لیکن اردو شعر کی تنقید میں ان کا کوئی مقام نہیں ہے ۔ مرزا خانی قتیل کے شاگرد تھے اور اور اس کی ذریت کے بارے میں غالب کی جو راے تھی ، وہ ہم سب کو معلوم ہے ۔ دراصل غالب نے خود انتخاب کیا اور حذف و اضافہ کا یہ عمل صرف ایک ہی مرتبہ نہیں کیا بلکہ ساری عمر اس پر عمل پیرا رہے (ص ۳۰ ۔ ۳۹)۔

مجھے مالک رام کے استدلال سے اتفاق ہے ، لیکن کالی داس گپتا رضا نے مجھے اپنے ۲۳ اگست ۱۹۹۳ء کے مکتوب میں لکھا :

> "میرے ذخیرۂ مخطوطات میں ایک عربی کتاب ہے جس میں مولوی فضلِ حق کے کئی طویل قصیدے ہیں ۔ اس سے ان کا عربی کا مشاق شاعر ہونا ثابت ہے اگر وہ عربی کے باقاعدہ شاعر تھے تو اردو اور فارسی کے بھی ہوں گے "۔

خود مالک رام صاحب کے مجموعے " تحقیقی مضامین" میں ایک مضمون ' مولانا فضلِ حق خیر آبادی ' شامل ہے ، اس میں لکھا ہے کہ جزیرۂ انڈمان میں انھوں نے اپنی سرگذشت عربی نظم و نثر میں لکھنا شروع کی (ص ۱۱۷) ۔ اس سے بھی ان کا عربی شاعر ہونا ثابت ہوتا ہے ۔ آٹھواں مضمون " چراغِ دیر " اس فارسی مثنوی کا تنقیدی تعارف ہے ۔ نواں مضمون ' غالب کی فارسی تصانیف ' " نگار " جولائی ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا ۔ اس میں غالب کی جملہ فارسی نظم و نثر کی تمام کتابوں کی تفصیل ہے ، بجز "گل رعنا" کے کہ اس کے بارے میں دو مضامین اسی شمارے میں شامل ہیں ۔ دسواں مضمون "دعاے صباح" ہے ۔ ان سے پہلے مولانا عرشی نے " نگار " لکھنؤ ، مئی ۱۹۳۱ء میں اس مثنوی کا تعارف اور متن شائع کر دیا تھا ۔ " دعاے صباح " حضرت علیؑ سے

منسوب ایک عربی دعا ہے جس کا غالب نے فارسی نظم میں ترجمہ کیا تھا۔ قاضی عبدالودود کہا کرتے تھے کہ غالب کو عربی بالکل نہیں آتی تھی۔ مالک رام بھی مانتے ہیں کہ مرزا کی عربی بہت کمزور تھی، اس لیے کسی نے عربی دعا کا فارسی نثر میں ترجمہ کیا جسے غالب نے نظم کیا (ص ۲۱۵)۔ یہ نظم ان کے بھانجے مرزا عباس بیگ کے ایما پر شائع ہوئی۔ مالک رام صاحب نے کئی صفحات میں اس تفصیل سے عباس بیگ کی سوانح لکھی ہے جیسے یہ ان کی چھٹی کی کھیر کھا چکے ہوں۔ ان سے پہلے کالی داس گپتا رضا نے اپنی کتاب "متعلقاتِ غالب" میں اور زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔ مالک رام صاحب کے بیان سے

ایک دل چسپ اقتباس سنیے:

> "سب سے پہلی حرکت انھوں نے یہ کی کہ اپنی چچی یعنی مرزا افضل بیگ کی جوان بنگالی بیوی کو گھر ڈال لیا۔ مرزا افضل بیگ جب کلکتے سے واپس آئے ہیں تو یہ خاتون وہاں سے ان کے ساتھ آئی تھیں۔ خدا معلوم، آپس میں باقاعدہ شادی بھی ہوئی تھی یا نہیں، لیکن بہرحال عرفِ عام میں وہ عباس بیگ کی چچی ہی تھیں۔ بظاہر افضل بیگ واپسی کے بعد زیادہ دن زندہ نہ رہے۔ یہ عورت جوان بھی تھی اور خوب صورت بھی، ادھر عباس بیگ کی بھی ابلتی جوانی اور سرخ و سپید رنگ۔ دونوں ایک دوسرے پر فدا ہو گئے۔ نتیجہ وہی نکلا جس کی توقع کی جا سکتی تھی۔ خاندان کے دوسرے افراد نے اس فعلِ شنیع پر دونوں کو اور خاص طور پر عباس بیگ کو بہت لعن طعن کی"۔
> (ص ۲۱۱)

سوانح دل چسپ ہے، لیکن اتنی تفصیل کی کیا ضرورت تھی؟

"سوالاتِ عبدالکریم" "برہانِ قاطع" کے سلسلے کا ایک آٹھ صفحوں کا رسالہ ہے جسے غالب نے عبدالکریم کے نام سے لکھا ہے۔ گیارھویں مضمون میں مالک رام نے اسی کا تعارف کرایا ہے اور آخر میں کچھ داخلی شواہد دیے ہیں کہ اسے کیوں غالب ہی

کی تصنیف مانا جائے گا۔ سوالات میں زیادہ تر غالب کے ایک مخالف کی زبانِ فارسی پر اعتراض ہیں۔

اگلا مضمون "احسان، غالب، ذکا" ہے۔ بہادر شاہ کے عہد میں دستور تھا کہ ملازموں کو چھ ماہ میں ایک بار تنخواہ ملتی تھی۔ بادشاہ چاندنی چوک اور کٹرہ نیل کے مہاجنوں سے قرض لے کر تنخواہیں بانٹ دیتے تھے۔ غالب کا چھماہی تنخواہ میں گزارہ نہ ہوتا تھا۔ اس پر انھوں نے بادشاہ کی خدمت میں ایک منظوم درخواست پیش کی کہ انھیں تنخواہ ماہ بہ ماہ ملے۔ اس کے تین اشعار یہ ہیں:

رسم ہے مردے کی چھماہی ایک
خلق کا ہے اس چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات
اور چھماہی ہو سال میں دو بار

میری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

مالک رام صاحب نے دریافت کیا ہے کہ یہ منظوم عرضی غالب کی ایجاد نہیں۔ اس میں انھوں نے حافظ عبدالرحمان جیو احسان کی تقلید کی ہے جنھوں نے غالب سے پہلے ظفر کے نام اسی زمین میں ایک قطعہ بھیجا تھا جس میں تنخواہ نہ ملنے کی دل چسپ داستان اور تنخواہ کی ادائگی کا تقاضا تھا (ص ۵۵ ۔ ۲۵۴)۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ غالب کے سامنے احسان کا قطعہ تھا۔ غالب نے بھی احسان کی طرح قرآن کا ایک جملہ مصرعِ ثانی کی شکل میں ہو بہو لے لیا ہے:

وقنا ربّنا عذاب النّار

غالب کی تقلید ان کے شاگرد حبیب اللہ ذکا حیدرآبادی نے کی۔ جب انھیں ایک مرتبہ نواب سالار جنگ کے یہاں سے تنخواہ ملی تو انھوں نے بھی اسی زمین میں ایک

قطعہ لکھ کر نواب صاحب کو بھیجا ۔ پہلے دو اصحاب کے مقابلے میں ذکا کے قطعے میں سنجیدگی ہے ۔

آخری مضمون کا عنوان " غالب اور تنافر " ہے ۔ مالک رام " دیوان غالب " کے لیے لکھتے ہیں :

" پچھلے دنوں میں نے یونہی سرسری طور پر دیوان کا اس پہلو سے جائزہ لیا تو اس میں توقع سے کہیں زیادہ تنافر کی مثالیں نظر آئیں " ۔ (ص ۹۵۹)

انگریزی میں ایک صنعت alliteration (سر حرفی) ہے جس میں گفتگو میں متواتر ایک آواز سے شروع ہونے والے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں ؛ اسے حُسن سمجھا جاتا ہے ۔ مالک رام صاحب نے اپنے مضمون کے بیش تر حصے میں غالب کے ایسے اشعار نقل کیے ہیں جن میں ایک آواز بار بار آئی ہے ، ضروری نہیں کہ لفظ کی ابتدا میں ہو ، وسط یا آخر میں بھی ہو سکتی ہے ۔ میری رائے میں ان میں سے ایک بھی مثال تنافر کی نہیں ۔ خود کہتے ہیں :

" آپ نے دیکھا کہ غالب کے کلام میں متعدد اصوات کی تکرار بکثرت موجود ہے ۔ تنافر یہ ہے کہ جب ایک ہی آواز کے تواتر سے کلام میں ثقالت پیدا ہو جائے اور اس کے پڑھنے یا سننے سے طبیعت کو ناگواری محسوس ہو تو اسے کلام کے عیوب میں شمار کرتے ہیں " ۔ (ص ۲۶۳)

دقت یہ ہے کہ بلاغت کی کتابوں میں فصاحت کی مفصّل تعریف نہیں ملتی ۔ بہرحال چونکہ فصاحت کلمے اور کلام دونوں میں ہوتی ہے ، اس لیے تنافر کا عیب بھی کلمے اور کلام دونوں میں ہوتا ہے ۔ " بحر الفصاحت " میں لکھا ہے :

" بعض چیزوں کو حِس معلوم کر لیتا ہے ، چنانچہ حروف اور کلمات کا تنافر حِس سے معلوم ہو جاتا ہے " ۔

(لکھنؤ ، ۱۹۵۷ ، ص ۳۸۳)

میری رائے میں کلمے میں تنافر اصوات وہ ہے جہاں دو قریب المخرج آوازیں متواتر یا

بہت قریب آجائیں جس کی وجہ سے لفظ کو روانی سے ادا نہ کیا جاسکے، مثلاً: ہجری ٹھاٹھ، ککنگف بیگ، یا لفظ میں ایسی آوازیں جمع ہوں جن سے ثقالت پیدا ہو جائے، مثلاً: کڈھیلا، چکڑ، ڈاڑھی، ڈھانڈا، ڈھینگرا، ڈھڈو، ٹھنڈا۔

تنافر کلام وہ ہے جہاں ایک لفظ کے آخر میں اور مابعد لفظ کے شروع میں یکساں یا قریب المخرج آواز آجائے یا جملے یا مصرع میں مماثل آوازیں اس کثرت سے آجائیں کہ ثقیل معلوم ہوں۔ جوش کی نظم "پند نامہ" کے یہ مصرعے دیکھیے:

چل چیخ، جھٹ چہاں چمیں، چنگھاڑ
جھٹ چیخ، چاؤں چاؤں، چیل چھاڑ
(الجھن آوارگی، ادھم ایٹھن)
بھونک بھوں بھوں، بھنن بھنن، بھن بھن
بو بھبک، بھبے، بکس، برر، بھونچال
(دبدبے، دندناہٹیں، دھمال)

قوسین والے مصرعوں میں تنافر کا شائبہ نہیں۔ اب یہ ذوق اور حس پر منحصر ہے کہ کوئی بقیہ مصرعوں میں مماثل آوازوں کے اجتماع کو تنافر کلام قرار دے یا انھیں سلیقے سے مجتمع کرنے والی قادر الکلامی۔ بہرحال میری رائے میں مالک رام کا یہ مضمون غیر ضروری ہے، کیونکہ اس میں جو اشعار درج کیے ہیں، ان میں تنافر ہے ہی نہیں۔

اس مجموعے کے کئی مضامین اہم ہیں مثلاً: 'دیوانِ اردو کی کہانی'، 'کلامِ غالب میں معاشرتی عناصر' اور 'غالب کی فارسی تصانیف'، لیکن بحیثیت مجموعی تحقیق غالبیات میں یہ مجموعہ "فسانۂ غالب" کی برابری نہیں کر سکتا کیونکہ اس میں بچی کھچی کھرچن کو جمع کیا گیا ہے۔

تحقیقی مضامین (۱۹۸۷ء)

مالک رام کے اس مجموعے پر ناشر نے سنہ اشاعت دسمبر۱۹۸۴ء لکھا ہے، لیکن مالک رام کے مقدمے پر یکم اکتوبر ۱۹۸۷ء کی تاریخ درج ہے۔ انھوں نے مجھے یہ کتاب ۳۱ مارچ ۱۹۸۸ء کو دستخط کر کے دی۔ اس سے میرا خیال ہے کہ یہ واقعی ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کے جملہ تیرہ مضامین میں سے چھ غالب سے متعلق ہیں۔ ان کے عنوانات اور ان کی اوّلین اشاعت کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ غالب کے فارسی قصیدے (کچھ نیا کلام)	"نقوش"، مارچ ۱۹۶۳ء
۲۔ "قادر نامہ" کا مصنّف	"اردو"، جولائی ۱۹۴۷ء
۳۔ غالب کا ایک نیا خط	"آج کل"، فروری ۱۹۶۵ء
۴۔ "نادر خطوط غالب" (مرتبہ رسا ہمدانی) پر ایک نظر	"جامعہ"، مارچ ۱۹۴۲ء
۵۔ "دستنبو"	"آج کل"، فروری ۱۹۶۷ء
۶۔ غالب اور صہبائی	"نگار"، رام پور، فروری ۱۹۴۳ء

پہلے ان کے مضمون 'غالب کے فارسی قصیدے (کچھ نیا کلام)' پر نظر ڈالتے ہیں۔ اس کی ابتدا میں لکھتے ہیں:

> "بہت دن ہوئے میں نے غالب کا فارسی دیوان مرتّب کیا تھا۔ اس کے لیے میں نے گیارہ نسخے استعمال کیے تھے، نو (۹) خطّی اور دو ان کی زندگی کے مطبوعہ نسخے۔ افسوس کہ ایک مرحوم مہربان کے کرم کے صدقے یہ شائع نہ ہوا خیر، یہ دوسرا قصہ ہے"۔ (ص ۱۱)

اس دل گداز بیان کو پڑھ کر قاری بھی مغموم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ آگے تدوین کے باب میں تفصیل دی جائے گی، یہ مہربان قاضی عبدالودود ہیں جنھوں نے مالک رام کے تیار کیے ہوئے مخطوطے کے درمیان سے کئی اجزا ضائع کر دیے۔ یہ مقالہ تحقیق کا بھی اچھا نمونہ ہے اور اس کے باوصف دل چسپ بھی۔ غالب نے متعدد قصیدے پہلے کسی

اور کی مدح میں لکھے تھے، بعد میں چند اشعار کی تبدیلی سے کسی اور کے نام جڑ دیے۔ مالک رام نے مخطوطات کی مدد سے کلیات مطبوعہ کے گیارہ فارسی قصیدوں کے اصل ممدوحین اور اشعار میں رد و بدل کا سراغ لگایا ہے۔ بعض تبدیلیاں دیکھ کر شاعر کی جودت اور ظرافت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً بہادر شاہ کے غسلِ صحت کے قصیدے کو قدرے تبدیلی سے ملکہ وکٹوریا کے سر منڈھ دیا، مرزا فخرو کے قصیدے کو بھی ملکہ وکٹوریا کی نذر کر دیا، ہاتھ کی صفائی دکھا کر بہادر شاہ ظفر کی مدح کے قصیدوں سے انگریز افسروں کو نواز دیا، ایک قصیدہ اصلاً غازی الدین حیدر اور معتمد الدولہ آغا میر کے نام منتقل کر دیا، امجد علی شاہ کا قصیدہ ان کے بیٹے واجد علی شاہ کا ورثہ ٹھہرا، گورنر جنرل ہارڈنگ کی مدح کا قصیدہ، راجا شیودھیان سنگھ والی الور کو تفویض کر دیا، بہادر شاہ ظفر کی مدح کا ایک قصیدہ مہاراجا نرندر سنگھ والی پٹیالہ کا مقسوم ٹھہرا۔ مالک رام نے ممدوحین کی تبدیلی کے علاوہ اشعار میں ردوبدل کی بھی نشان دہی ہے۔

حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں اردو قصیدوں کے لیے لکھا ہے:

> "مدح میں اکثر ایک نام کے سوا کوئی خصوصیت ایسی مذکور نہیں ہوتی جو ممدوح کی ذات کے ساتھ مختص ہو بلکہ ایسے حاوی الفاظ میں مدح کی جاتی ہے کہ اگر بالفرض مدّاح اس علت میں کہ فلاں شخص کی مدح کیوں کی، عدالت میں ماخوذ ہو جائے تو قصیدے میں کوئی لفظ ایسا نہ ملے جس سے اس کا جرم ثابت ہو سکے"۔

(طبع دہلی، ستمبر ۱۹۹۹ء، ص ۸۹۔۹۰)

غالب کے فارسی قصیدے احمد کی ٹوپی محمود کے سر پر چست کر دینے کی دل چسپ مثال ہیں۔ دوسرا مضمون ' قادر نامہ کا مصنف ' ہے۔ میرن صاحب اور امیر مینائی کی شہادت ہے کہ یہ منظوم لغت غالب کی تصنیف ہے۔ اس کے باوجود مولانا غلام رسول مہر نے اس کے غالب کی تخلیق ہونے پر شک کیا۔ مالک رام نے متعدد اشعار کا تجزیہ کر کے ثابت کیا کہ یہ غالب ہی کی تصنیف ہے۔ یہ داخلی شہادتیں بہت مضبوط

ہیں ۔ تیسرا مضمون ' غالب کا ایک نیا خط ' " آج کل " فروری ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا ۔ اس میں حکیم غلام نجف خاں کے نام ایک اردو خط پیش کیا ہے اور ساتھ ہی اس کی شانِ نزول دی ہے ۔ آخری پیراگراف میں خطوطِ غالب کے بعض قدیم مجموعوں میں غلام نجف خاں سے متعلق تین خطوں کے غلط انتساب کی نشان دہی کی ہے (ص ۵۱) ۔

چوتھا مضمون ' نادر خطوطِ غالب (مرتبہ رسا ہمدانی) پر ایک نظر ' اولاً رسالہ "جامعہ" ، مارچ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا ، اس کے بعد زیرِ نظر مجموعے میں ۔ سید محمد اسماعیل رسا ہمدانی گیاوی ، ٹرپل ایم ۔ اے (گولڈ میڈلسٹ) نے یہ مجموعہ ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ سے شائع کیا اس میں کل ۲۷ خطوط ہیں ، ۲۳ مرتب کے پردادا سید کرامت حسین ہمدانی کے نام ، تین صفیر بلگرامی کے نام اور ایک فرزند علی شاہ صوفی منیری کے نام ۔ ناشر پیارے لال شاکر میرٹھی نے اشاعت سے قبل یہ خطوط مالک رام کو دکھائے ۔ مالک رام نے بادی النظر میں دیکھ کر شاکر سے کہا کہ یہ خطوط جعلی ہیں اور وہ انھیں شائع نہ کریں چونکہ مالک رام کے پاس اس وقت کوئی کتاب نہ تھی اور وہ ایک لمبے سفر پر جانے والے تھے ، اس لیے مزید ثبوت مہیا نہ کر سکے ۔ شاکر نے کتاب شائع کر دی ۔

جب مالک رام نے خطوط کو بہ اطمینان دیکھا تو انھیں معلوم ہو گیا کہ رسا نے غالب کے شائع شدہ خطوط میں سے ادھر ادھر کے ٹکڑے جوڑ کر یہ خطوط مرتب کیے ہیں ۔ اپنے مضمون میں انھوں نے ۲۳ خطوں کے ماخذ کی نشان دہی کی ہے ۔ اس کے علاوہ انھوں نے مزید ثبوت فراہم کیے ، مثلاً خط میں دی ہوئی تاریخ تک متن میں مندرجہ بعض واقعات ظہور پذیر نہیں ہوئے تھے ، یہ خطوط کسی بے تکلف دوست ہی کو لکھے جا سکتے تھے اور کوئی شہادت نہیں کہ کرامت ہمدانی غالب کے بے تکلف دوست تھے ۔ آخری بات یہ کہ یہ خطوط غالب کی مکتوب نگاری کے بعض خصائص سے معرا ہیں ۔ مالک رام نے سب سے پہلے اس جعل کا بھانڈا پھوڑا ۔ ان کے کچھ عرصے کے بعد قاضی عبدالودود کا مضمون " معاصر " جنوری ۱۹۴۳ء میں آیا ۔

پانچواں مضمون ' دستنبو ' محض چند صفحوں کا ہے ۔ اس میں انھوں نے دکھایا ہے کہ غالب نے یہ کتاب یہ جاننے کے بعد لکھی کہ فتح انگریزوں کی ہو گی ۔ چونکہ غالب نے طے کر نا تھا کہ کتاب انگریز حکومت کو پیش کریں گے ، اس لیے اسی نقطۂ نظر سے

لکھا اور بعض جگہ دانستہ غلط بیانی کی۔ چھٹا مضمون "غالب اور صہبائی" "نگار" رام پور، فروری ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ اس میں دکھایا ہے کہ غالب نے مولانا صہبائی کے بارے میں ہمیشہ معاندانہ اور اہانت آمیز الفاظ کا استعمال کیا ہے، بالخصوص اس لیے کہ صہبائی کے ایک شاگرد نے معرکۂ "برہانِ قاطع" میں غالب کے خلاف ایک رسالہ لکھا تھا۔

"تحقیقی مضامین" کے ان چھ مضامین میں اہم ترین مضمون "نادر خطوط غالب" سے متعلق ہے اور اس کے بعد غالب کے فارسی قصیدوں میں الٹ پھیر کی نشان دہی والا۔ ان چھ مضامین کے علاوہ دو مضمون ان شخصیتوں کے بارے میں ہیں جو غالب کی زندگی سے جڑے ہوئے ہیں۔ مولانا فضل حق خیر آبادی اور ذوق۔ چونکہ ان دونوں مضامین میں غالب سے متعلق کچھ نہیں، اس لیے ان سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

متفرق مضامین

مجموعوں کے بعد غالب سے متعلق ان مضامین کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے جو متفرق رسالوں یا مجموعوں میں شائع ہوئے۔ ان میں سے صرف پانچ چھ میری نظر سے گزرے ہیں، جیسے سب کے بارے میں عرش ملسیانی کے مضمون نگارشات مالک رام سے اخذ کرنے پر اکتفا کروں گا۔ مضامین کو زمانی ترتیب سے لیتا ہوں:

۱۔ غالب کی ایک غیر مطبوعہ تحریر — "ادبی دنیا"، لاہور، ستمبر ۱۹۳۹ء

غالب نے دلی سوسائٹی میں ایک مضمون پڑھا تھا، اسی کو تلاش کر کے پیش کیا ہے۔

۲۔ غالب اور قتیل — "ادبی دنیا"، مارچ ۱۹۴۰ء

اسد علی انوری فرید آبادی نے اس نام کی کتاب میں قتیل کی حمایت اور غالب کی مخالفت کی تھی۔ مالک رام کے نزدیک انھوں نے غلط استدلال سے غلط نتیجے نکالے تھے انھیں کی تردید کی ہے۔

۳۔ غالب کی اردو خطوط نویسی کی تاریخ — "جامعہ"، فروری ۱۹۴۲ء

اس میں ثابت کیا ہے کہ غالب یقیناً ۱۸۴۸ء میں، اور غالباً اس سے بھی پیش تر، اردو میں خط لکھنے لگے تھے۔

۴۔ مرزا غالب اور امیر مینائی "نوائے ادب"، بمبئی، جنوری ۱۹۵۵ء

"قاطعِ برہان" کے معرکے میں دونوں طرف سے کچھ نظمیں بھی لکھی گئی تھیں۔ ایک نظم محمد امیر لکھنوی کے نام سے تھی۔ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کا خیال تھا کہ یہ مشہور شاعر امیر مینائی کی تھی۔ مالک رام نے اس رائے کی تردید کی ہے۔

۵۔ باغِ دو در "آج کل"، مارچ ۱۹۵۵ء

غالب نے "سبد چین" کے بعد جو مزید فارسی نظم و نثر تخلیق کی، اسے شامل کر کے "سبد چین" کا ایک اضافہ شدہ نسخہ تیار کیا جس کا نام "باغِ دو در" رکھا۔ اس کی تاریخ "سبدِ باغِ دو در" سے ۱۲۸۳ھ نکلتی ہے۔ یہ مجموعہ غالب کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ خوش قسمتی سے اس کا اصل نسخہ لاہور کے سید وزیرالحسن عابدی کو مل گیا۔ انھوں نے اس کا تعارف رسالہ "آج کل" دہلی بابت ۱۵ فروری ۱۹۴۷ء میں کرایا۔ عابدی کے نسخے کی ایک نقل عرشی صاحب کو مل گئی۔ مالک رام نے اسی نقل کو دیکھ کر اس انتخاب کا تعارف کرایا۔ اس تصنیف کی بعد کی تاریخ یہ ہے:

وزیر حسن عابدی نے "باغِ دو در" کا متن پہلی بار "اورینٹل کالج میگزین" لاہور میں دو قسطوں میں اگست ۱۹۶۰ء اور اگست ۱۹۶۱ء میں شائع کیا۔ ان دونوں قسطوں کے آف پرنٹس کتابی صورت میں یک جا کر دیے گئے اور ان پر لاہور بارِ اول ۱۹۴۲ء کی تاریخ ڈال دی تھی۔ (۱۱) عرشی صاحب نے اسی نسخے کی تلخیص رسالہ "اردو" کراچی، غالب نمبر حصۂ اول، ۱۹۶۹ء میں شائع کر دی اور اسی سال انجمن ترقی اردو پاکستان سے کتابی شکل میں بھی شائع ہوئی۔ اس کے بعد وزیر حسن عابدی کی مرتب کردہ کتاب، ۲۳۰ صفحات کے تحقیق نامے کے ساتھ، پنجاب یونیورسٹی لاہور نے ۱۹۷۰ء میں شائع کی۔ عرشی صاحب نے اپنے مرتب کردہ نسخے کا نام "سبدِ باغِ دو در" جو رکھا وہ مناسب نہ تھا غالب نے اس مجموعے کا نام "باغِ دو در" رکھا تھا۔ "سبدِ باغِ دو در" اس کی تاریخ تھی۔ حیرت ہے کہ مالک رام نے بھی اپنے مضمون "غالب کی فارسی تصانیف" مشمولہ "گفتارِ غالب" میں اس کا ذکر "سبدِ باغِ دو در" کے عنوان سے کیا ہے، محض "باغِ دو در" سے نہیں۔ (گفتارِ غالب، ص ۱۰۳)

مالک رام مندرجہ بالا اندراج میں اطلاع دیتے ہیں کہ "باغ دو در" میں "سبد چین" سے محض ۱۳۶ شعر زیادہ ہیں۔ ان میں سے ۲۰ کو چھوڑ کر بقیہ ۱۱۶ شعر وہ اپنی مرتبہ "سبد چین" اور بعض مضامین میں شائع کر چکے تھے۔ (گفتارِ غالب، ص ۱۹۳)

۶۔ غالب کا ایک شعر "آج کل"، فروری ۱۹۵۶ء

زیرِ بحث شعر ہے:

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

اس سے عام طور پر سمجھ لیا جاتا ہے کہ غالب صنف غزل کے خلاف ہو گئے تھے۔ مالک رام نے صراحت کی کہ انھوں نے غزل کو تجمل حسین خاں کی مدح کے لیے ناکافی سمجھا۔

۷۔ غالب کا ایک گم شدہ قصیدہ "شاعر"، سال نامہ ۱۹۶۰ء

اس میں غالب کے ایک فارسی قصیدے کی کئی منزلوں کے ممدوحین کی تعیین کی گئی ہے۔ یہ مضمون ان کے طویل مقالے، غالب کے فارسی قصیدے (کچھ نیا کلام)، (نقوش، مارچ ۱۹۶۳ء نیز "تحقیقی مضامین") میں ضم کر لیا گیا۔

۸۔ تبصرۂ دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی "فکر و نظر"، جنوری ۱۹۶۱ء

مالک رام نے دیوان غالب کا ایک ایڈیشن آزاد کتاب گھر دہلی سے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔ مولانا عرشی کا تاریخی کارنامہ دیوان غالب۔ نسخۂ عرشی ۱۹۵۸ء میں آیا۔ اس کی داد دیتے ہوئے مالک رام نے اس پر "فکر و نظر" علی گڑھ، جنوری ۱۹۶۱ء میں ایک تبصرہ کیا محمد طفیل نے "نقوش"، نومبر ۱۹۶۳ء میں اسے ڈائجسٹ کیا۔ مالک رام نے اس میں عرشی صاحب کی تدوین سے کچھ اختلافات کیے تھے۔ [۱۱] عرشی صاحب نے تین سال بعد اس کا جواب ' دیوان غالب نسخۂ عرشی ' کے عنوان سے "نقوش"، نومبر ۱۹۶۳ء میں لکھا۔ معلوم ہوتا ہے مدیر کی اصلی غرض اس جوابی مضمون کو شائع کرنے کی تھی۔ اس کے حوالے کے لیے اس سے قبل مالک رام کا اصل مضمون بھی چھاپ دیا گیا۔ غالبیات کے چوٹی کے دو ماہرین کا یہ مباحثہ بہت اہم ہے، اس لیے یہاں اس کے اہم نکات درج کیے جاتے ہیں۔

مالک رام نے اپنے تبصرے میں چار نکات پیش کیے:

۱۔ "یادگارِ غالب" بہرہ فارسی میں حالی لکھتے ہیں کہ "حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے مرزا سے، جب وہ کلکتے میں مقیم ہیں، خواہش کی ہے کہ اگر آپ نے اپنی کچھ نثریں جمع کی ہوں تو بھیج دیجیے" (طبع اول، ص ۱۸۵)۔ اس کے جواب میں مرزا نے ان کا شکریہ ادا کیا اور "دیوان ریختہ" کا دیباچہ اور "گل رعنا" میں شامل نثریں بھیجیں۔

مولانا عرشی نے "نسخۂ عرشی" کے دیباچے میں لکھا:

"چونکہ اس خط میں ترتیب و انتخاب دیوان کا ذکر ہے اور مولانا نظامی بدایونی کو 'دیوان غالب' کا ایسا مخطوطہ ملا تھا جس میں دیباچے کی تاریخ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ (۱۳ اپریل ۱۸۳۳ء یعنی سفرِ کلکتہ کے بعد) درج تھی، اس لیے مولانا حالی کے بیان کو نظری قرار دے کر تاریخ انتخاب دیوان کو اس تاریخ (۱۲۴۸ھ) سے کچھ قبل ماننا پڑے گا"۔

(دیباچہ نسخۂ عرشی، ص ۲۵۔۲۴)

عرشی صاحب نے اپنے دیباچے ص ۵۸ پر غالب کے مکتوب بنام احسن اللہ خاں کو آخر سنہ ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۳ء) کے بعد کا مانا ہے۔

مالک رام اپنے تبصرے میں لکھتے ہیں:

"اگر ترتیب دیوان کا کام کلکتے سے جانے کے بعد دہلی میں ۱۲۴۸ھ میں ہوا نیز حکیم احسن اللہ خاں کے نام کا خط کلکتے سے نہیں لکھا گیا تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ غالب سفرِ کلکتہ کے بعد ۱۲۴۸ھ تک کب دہلی سے اتنے عرصے باہر رہے کہ حکیم صاحب ان سے ان کی تازہ وارد نثروں کی فرمائش کرتے؟ مالک رام کی رائے میں یہ خط کلکتے سے لکھا گیا اور اس میں دیباچۂ دیوان کے ذکر کے یہ معنی ہیں کہ متداول دیوان کی تدوین کلکتے ہی میں ہو گئی تھی اور اس سے 'گلِ رعنا' انتخاب کیا گیا"۔

(نقوش، ص ۱۴۷)

۲۔ دیوانِ غالب اردو کا تیسرا ایڈیشن مطبع احمد دہلی سے ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا۔ عرشی صاحب کے نزدیک یہ ایڈیشن ضیاء الدین نیّر کے نسخۂ دیوان غالب پر مبنی ہے۔ موخر الذکر مخطوطہ غالب کے رام پور کے نسخے سے مقابلہ کر کے صحیح کر لیا تھا (دیباچہ نسخۂ عرشی، ص ۱۰۱۔ ۱۰۳)۔ مالک رام کی رائے میں مطبع احمدی کا ایڈیشن نیّر کے مخطوطے سے نہیں، ناظر حسین میرزا کے قلمی نسخے سے تیار کیا گیا۔

۳۔ عرشی صاحب نے رائے ظاہر کی ہے کہ مرزا صاحب کو احمدی پریس میں دیوان چھپوانے کی خواہش نہ تھی جیسا کہ خود انھوں نے خاتمۃ الطبع میں لکھا ہے۔

مالک رام کہتے ہیں کہ خاتمۃ الطبع میں مرزا نے لکھا ہے:

"مخلص و داد آگین میر قمر الدین کی کارفرمائی اور خان صاحب منشی محمد حسین کی دانائی مقتضی اس کی ہوئی کہ دس جزوں کا رسالہ ساڑھے پانچ جزوں میں منطبع ہوا۔ اگرچہ یہ انطباع میری خواہش سے نہیں ہوا، لیکن ہر کاپی میری نظر سے گزرتی رہتی ہے"۔

عرشی صاحب نے فقرہ "اگرچہ یہ انطباع میری خواہش سے نہیں ہوا" سے یہ نتیجہ نکالا کہ مرزا کو اس مطبع میں دیوان کا چھاپا جانا ہی سرے سے منظور نہیں تھا، حالانکہ مرزا کا مدعا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہتمم مطبع کی کارفرمائی اور صاحب مطبع کی دانائی سے دس جزوں کا رسالہ ساڑھے پانچ جزوں میں منطبع ہوا۔ یہ بات میری خواہش کے خلاف ہوئی۔

۴۔ نسخۂ رام پور جدید غالب نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے پہلے تحفے میں بھیجا [عرشی صاحب کی رائے میں اس کی ترتیب مارچ ۱۸۵۵ء اور ستمبر ۱۸۵۵ء کے بیچ ہوئی (دیباچہ ص ۸۸) گیان چند] عرشی صاحب نے نسخۂ عرشی کے جزو "نوائے سروش" کی بنیاد اس پر رکھی ہے۔ اصول یہ ہے کہ مصنف کی زندگی کے آخری ایڈیشن کو متن کے لیے استعمال کیا جائے بشرطے کہ یہ یقین ہو کہ مصنف نے اس کا مسودہ دیکھا تھا۔ چونکہ دیوان کے چوتھے اور پانچویں ایڈیشن (۱۸۶۱ء، نیز ۱۸۶۳ء) خود غالب کے دیکھے ہوئے ہیں، اس صورت میں ۱۸۶۳ء کے ایڈیشن کو متن کی جگہ دینی چاہیے تھی۔

عرشی صاحب نے ان نکات پر یوں اظہارِ خیال کیا:

۱۔ انھوں نے یہ مان لیا کہ حکیم صاحب کو خط کلکتے ہی سے لکھا گیا، لیکن اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دیباچہ متداول دیوان کے لیے لکھا گیا اور متداول دیوان کی ترتیب کلکتے میں ہوئی۔ مذکورہ دیباچہ انتخاب متداول دیوان سے پہلی منزل، نسخہ شیرانی کا ہو سکتا ہے۔ عرشی صاحب نے "گلِ رعنا" اور متداول دیوان کا تقابلی مطالعہ کر کے ثابت کیا کہ متداول دیوان "گلِ رعنا" سے بعد کی منزل ہے۔ وہ اپنے اس موقف پر قائم رہے کہ انتخاب دیوان ۱۲۳۸ھ میں دہلی میں ہوا۔

۲۔ دہلی والا وہ نسخہ جس سے نسخہ احمدی چھپا ہے، بظاہر حسین مرزا کا نسخہ معلوم ہوتا ہے لیکن یہ مسئلہ سردست بحث طلب نہیں (نقوش، ص ۱۰۱)۔ یہاں انھوں نے مالک رام کی بات مان لی۔

۳۔ مالک رام کے اس نکتے کے بارے میں عرشی صاحب خاموش ہیں کہ غالب نے احمدی میں دیوان کے انطباع کو ناپسند نہیں کیا تھا بلکہ دس جزو کے مواد کو ساڑھے پانچ جزو میں ٹھونس دینے پر کبیدہ ہوئے تھے۔

۴۔ عرشی صاحب نے ترتیبِ اصنافِ سخن، طریقِ املا اور بہت سے مصرعوں کی ترمیمیں درج کر کے یہ اصرار کیا کہ نسخہ رام پور، احمدی و نظامی ایڈیشن سے زیادہ ترقی یافتہ ہے، اس لیے صحیح معنی میں غالب کی زندگی کا آخری ایڈیشن اسی کو کہیں گے عرشی صاحب نے واضح کیا کہ نسخہ عرشی کے اختلافاتِ نسخ سے ظاہر ہے کہ انھوں نے متعدد موقعوں پر مطبوعہ نظامی ایڈیشن کو نسخہ رام پور پر ترجیح دی ہے لیکن بہت سے مقامات پر نہیں دی، کیونکہ ان کی رائے میں خوش ذوقی کے پیمانے سے پیش رو انتخاب (نسخہ رام پور جدید) کے اشعار بہتر تھے جبکہ بعد کے ایڈیشن میں ان کا لطف جاتا رہا۔ آخر مالک رام نے بھی اپنے مرتبہ دیوان میں ہر جگہ نظامی ایڈیشن کو حرفِ آخر نہیں مانا۔

دونوں مضامین کا خلاصہ ختم ہوا۔ عرشی صاحب متداول دیوان کی تاریخ ۱۲۳۸ھ پر مصر رہے۔ انھوں نے مالک رام کے اس سہو کی شافی تصحیح کر دی کہ "گلِ رعنا" متداول دیوان کا انتخاب ہے۔

مالک رام نے اپنے اتنے پُر مغز اور اہم مضمون کو اپنے کسی مجموعے میں شامل نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ وہ تدوینِ دیوان سے متعلق اپنے موقف میں مذبذب ہو گئے۔ "ذکرِ غالب" طبع پنجم ۱۹۷۶ء میں مندرجہ بالا تبصرے کے موقف میں یوں ترمیم کرتے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ اس زمانے میں شاید انھوں نے صرف اردو کلام کا ایک مفصل انتخاب مرتب کیا ہو جو متداول دیوان کی اوّلین یا ابتدائی شکل کہی جا سکتی ہے"۔ (ص ۱۴۵)

اور "گفتارِ غالب" ۱۹۷۷ء میں اپنے مضمون 'دیوانِ اردو کی کہانی' میں متداول دیوان کے سلسلے میں فصل ۶ میں لکھتے ہیں کہ "گلِ رعنا" کے ساتھ کلکتے میں متداول دیوان تیار کر کے اس پر فارسی دیباچہ لکھ دیا۔ جب نسخۂ دیوان کو آخری شکل دی تو دیباچے پر نظرِ ثانی کر کے تاریخ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ (۱۳ اپریل ۱۸۳۳ء) لکھ دی۔ (ص ۷۰-۷۱)

مالک رام صاحب کا یہ اصرار کرنا کہ متداول دیوان کی اوّلین شکل کلکتے میں تیار ہو چکی تھی، مرغے کی ایک ٹانگ ہونے پر اصرار معلوم ہوتا ہے جو عرشی صاحب کے تقابلی مطالعے کے بعد بے بنیاد نظر آتا ہے۔ متداول دیوان بالیقین "گلِ رعنا" کا توام نہیں، اس کے بعد کا ہے۔

اب اس مضمون سے آگے بڑھ کر چند اور متفرق مضامین کو دیکھتے چلیں۔

۹۔ غلطی ہائے مضامین "ماہِ نو" ،اکتوبر ۱۹۴۳ء

اس میں سید قدرت نقوی کے ایک مضمون کی اغلاط کی تصحیح کی ہے۔

۱۰۔ غالب اور رقیب "نقوش" ، غالب نمبر حصۂ اوّل، ۱۹۶۹ء

"نقوش" کے اس مہتم بالشان شمارے میں مالک رام نے محض ڈھائی صفحے کا یہ تنقیدی مضمون لکھا جو ان کے پایے کے ماہرِ غالبیات کو زیب نہیں دیتا۔ غالب صدی کے سال میں ان کے وقت اور قلم پر ہر طرف سے مطالبے ہو رہے تھے، شاید وہ "نقوش" کے لیے وقت نہ نکال سکے۔

۱۱۔ غالب اور یو پی — "نذرِ مقبول"، جون پور، فروری ۱۹۷۰ء

"نذرِ مقبول" مقبول احمد لاری کی خدمت میں پیش کی گئی۔ اس مضمون میں یوپی کی علمی اور معاشرتی زندگی میں غالب اور ان کے شاگردوں کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔

۱۲۔ غالب کی ایک نئی رباعی — "تحریر"، جلد ۵، شمارہ ۳، ۱۹۷۱ء

اس مختصر مضمون کے دو موضوعات ہیں۔ مالک رام کے پاس فارسی دیوانِ غالب طبعِ اوّل ۱۸۴۵ء کی ایک جلد ہے۔ اس کے حاشیے میں غالب کے شاگرد جواہر سنگھ جوہر نے ایک فارسی غزل نقل کر کے اس کی تاریخ دسمبر ۱۸۵۳ء درج کی ہے۔ یہ غزل پہلی بار کلیاتِ غالب ۱۸۶۳ء (دیوان کی توسیع شدہ طبعِ دوم) میں ملتی ہے۔ جوہر کے نوٹ سے اس کی تاریخِ تصنیف معلوم ہو گئی۔

اسی دیوان طبعِ اوّل کے آخر میں جوہر کے قلم سے غالب کی ایک نئی فارسی رباعی درج ہے۔ چونکہ غالب نے اسی موضوع پر ایک اور بہتر رباعی کہی ہے، اس لیے شاید غیر مطبوعہ رباعی کو قلم زد کر دیا۔ عرش ملسیانی نے "ارمغانِ مالک" میں "نگارشاتِ مالک رام" میں اس مضمون کے حوالے سے جو نئی رباعی درج کی ہے، وہ دراصل مطبوعہ رباعی ہے۔ وہ سہواً غیر مطبوعہ نئی رباعی کی جگہ مطبوعہ رباعی نقل کر گئے۔

مالک رام صاحب نے غالب سے متعلق دوسروں کی دو کتابوں کے مقدمے بھی لکھے وہ یہ ہیں:

عتیق بھوروی: "مرقعِ غالب"، الٰہ آباد، ۱۹۵۸ء

نریش کمار شاد: "محاوراتِ غالب"، دِلّی، ۱۹۶۷ء

عرش ملسیانی نے مالک رام کے دو انگریزی مضمونوں کا بھی ذکر کیا ہے:

1- Ghalib the Man and Poet

2- The Works of Ghalib

یہ دونوں مضمون حکومتِ ہند کی وزارتِ اطلاعات و نشریات کی فرمائش پر فروری [illegible] میں لکھے گئے۔ عرش لکھتے ہیں:

"ان مضمونوں کا ترجمہ دنیا کی بیش تر زبانوں میں ہوا تھا"۔

(ارمغانِ ملک، ص ۱۳)

یہ یقیناً مبالغہ ہے۔ دنیا میں ہزاروں زبانیں ہیں۔ یہ کہنا بہتر ہوتا کہ ان مضامین کا ترجمہ دنیا کی بیش تر اہم زبانوں میں ہوا۔

غالبیات پر ان کے تقریباً پچاس مضامین پر نظر کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی زندگی اور تصانیف کے بارے میں تحقیقی معلومات کے اعتبار سے یہ مضامین ان کی مستقل کتابوں سے تھوڑے ہی ہلکے رہتے ہیں۔ ذیل کے مضامین اہلِ نظر سے داد طلب ہیں:

۱۔ مرزا غالب (انشائے خاکہ)

۲۔ تاریخِ ولادت

۳۔ میرزا یوسف

۴۔ عبدالصمد، استادِ غالب

۵۔ نواب شمس الدین احمد خاں

۶۔ مقدمۂ پنشن کا عرضی دعویٰ

۷۔ سکے کا الزام اور اس کی حقیقت

۸۔ غالب سے منسوب دوسرا سکہ

۹۔ دربارِ رام پور سے تعلقات

۱۰۔ کلامِ غالب میں معاشرتی عناصر

۱۱۔ دیوانِ اردو کی [illegible]

۱۲۔ غالب کی فارسی تصانیف

۱۳۔ غالب کے فارسی قصیدے (کچھ نیا کلام)

۱۴۔ "نادر خطوطِ غالب" پر ایک نظر

۱۵۔ تبصرۂ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی

اگر مالک رام غالب پر مستقل کتابیں نہ لکھ کر محض یہ مضامین ہی تصنیف کر دیتے تو یہ تاریخِ ادب میں ان کی بقائے دوام کے لیے کافی تھے۔

حواشی

(۱) "غالب" از غلام رسول مہر، بحوالہ خواجہ احمد فاروقی: معرکۂ غالب و حامیانِ قتیل "احوالِ غالب"، طبعِ دوم، ص ۱۹۳

(۲) اوم پرکاش بجاج: "ذکرِ غالب، ایک مستند سوانح"، "مالک رام، ایک مطالعہ" ص ۲۹

(۳) "بارِ دو در"، مشمولہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن (مؤلف): غالب کا علمی سرمایہ (لاہور، فروری ۱۹۸۹ء) ص ۰۰

(۴) مالک رام صاحب کو یہ مضمون لکھنے کی یہ پاداش ملی کہ ان کی ہجو نگاری کے لیے امروہے سے "نگارشات" نام کا ایک بازاری پرچہ جاری کیا گیا جس کا خاص مقصد مالک رام صاحب کی اور میری ہجو کرنا تھا۔

چوتھا باب

تدوین اور ادارت

مالک رام۔ دو کے قابلِ ذکر مدوّنوں میں سے ہیں۔ لیکن ان کی اہم تدوینات غالب سے متعلق نہیں۔ "کربل کتھا" اور ابوالکلامیات میں ہیں۔ ان کی غالبیات کی تدوینیں زیادہ عالمانہ نہیں۔ اگر ان کی کلیاتِ غالب فارسی شائع ہو گئی ہوتی تو وہ اعلا معیار کا کام مانی جا سکتی تھی۔ ان کی بقیہ تدوینات غالب ان کی تدوینات ابوالکلام کے پایے کی نہیں۔ ذیل میں ان کا تین زمروں میں جائزہ لیا جاتا ہے:

فارسی تالیفات۔ فارسی اردو مشترک تالیف۔ اردو تالیفات

فارسی کی تدوینات تین ہیں، دو مطبوعہ، ایک غیر مطبوعہ۔

سبد چین

غالب کی فارسی مثنوی "ابرِ گہربار" ۱۸۶۳ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ اس کے آخر میں دو قصائد اور کچھ قطعات وغیرہ شامل کر دیے گئے تھے۔ اس سے غالب کو خیال آیا کہ کلیاتِ فارسی کی اشاعت کے بعد انھوں نے فارسی میں جو متفرق کلام کہا ہے، اسے بھی شائع کر دیا جائے۔ دوستوں سے لے کر جمع کیا۔ زوالِ صحت کی وجہ سے اسے باقاعدہ ترتیب دینے کی ہمت نہ کر سکے۔ جس طرح ملا تھا، اسی طرح بے ترتیبی سے "سبد چین" کے نام سے اگست ۱۸۶۷ء میں شائع کر دیا۔ دیباچے میں غالب نے اس نام کے یہ معنی لکھے ہیں:

"سبد چین' میوہ را گویند کہ پایان موسم بر شاخسار ماند و چوں آں را بچینند شاخسار بے بار ماند"۔

وزیرالحسن عابدی نے بھی یہ کتاب مرتب کی۔ وہ اس کے معنی یوں لکھتے ہیں:

"سبد چین (س/ب مفتوح، د ساکن) ترکیب اضافی نہیں ہے۔ مصدر چیدن سے اسم مفعول سماعی ترکیبی ہے، یعنی میوۂ چیدہ در سبد، یا بچا کھچا ٹوکری بھر پھل جو فصل ختم ہونے پر رہ جاتا ہے۔ یہی معنی غالب نے اپنے دیباچے میں بتائے ہیں"۔

مالک رام کے مطابق "سبد چین" طبع اول ۱۸۶۷ء میں ۷۳۵ شعر ہیں ("ذکرِ غالب" طبع پنجم، ص ۱۵۵)۔ وزیرالحسن عابدی کا کہنا ہے کہ یہ تعداد اصل میں ۷۵۳ ہے ("سبد چین"، لاہور ۱۹۶۹ء، ص ۲۰، بحوالہ معین الرحمان، ص ۲۴۴)

مالک رام کو ۱۹۳۶ء میں "سبد چین" دیکھنے کا شوق ہوا۔ طبعِ اول نہایت نادر تھی انھیں صدر یار جنگ کے کتب خانے میں اس کا پتا چلا۔ انھوں نے نواب صاحب کو لکھا کہ یہ کتاب انھیں مستعار دے دی جائے۔ اس پر نواب صاحب نے ایک کاتب سے اس کی نقل کرا کے ۱۹۳۷ء میں بھیج دی۔ چونکہ نقل میں بہت سی غلطیاں تھیں اس لیے مالک رام خود علی گڑھ گئے اور نقل کی تصحیح کی (کالی داس گپتا، "مالک نامہ" ص ۴۳)۔ مالک رام نے اسے ۱۹۳۸ء میں شائع کر دیا۔ حبیب گنج سے انھیں غالب کی تصویر بھی ملی تھی، وہ بھی اپنے نسخے کی ابتدا میں شامل کر دی۔

مالک رام کا ایڈیشن طبعِ اول کا مثنیٰ نہیں بلکہ ترمیم و اضافہ کے بعد تیار کیا گیا ہے اس کے دو خصائص ہیں:

۱۔ طبعِ اول میں کلام بے ترتیب تھا، طبعِ دوم میں مرتب نے صنف وار سلیقے سے مرتّب کر دیا ہے۔

۲۔ کلیات کے باہر جو کلام مختلف کتابوں میں منتشر پڑا تھا اور کسی مجموعے (بشمول "سبد چین"، طبعِ اول) میں شامل نہیں ہوا تھا، اسے بھی طبعِ دوم میں شامل کر لیا ہے۔

"سبد چین" طبعِ اول میں ایک فحش ہجویہ رباعی تھی، مالک رام نے طبعِ دوم میں

اسے حذف کر دیا ("ذکرِ غالب"، طبعِ پنجم، ص ۲۱۹)۔ مالک رام نے اپنے ایڈیشن کے اشعار کی تعداد ۸۲۳ لکھی ہے (ایضاً، ص ۱۵۷)۔ معین الرحمان کے مطابق دراصل کُل ۸۰۸ شعر ہیں۔ میں نے بھی شمار کیا اور ۸۰۸ ہی پائے۔ معین الرحمان کے مطابق مالک رام کو اس لیے سہو ہوا کہ ص ۵۴ کے حاشیے میں کسی دوسرے شاعر کا ۱۳ شعروں کا قطعہ درج ہے۔ ان کے اشعار کو بھی شامل کر لیا ہو گا (علمی سرمایہ، ص ۳۶ ـ ۲۳۵) لیکن یہ اشعار ملا کر بھی ۸۲۱ ہوتے، ۸۲۳ نہیں۔

اگر طبعِ اوّل میں ۷۵۴ شعر تھے جن میں سے ایک رباعی کے دو شعر سوخت کر دیے گئے اور طبعِ دوم میں ۸۰۸ شعر ہیں تو طبعِ دوم میں ۵۶ شعروں کا اضافہ ہوا، مرتّب کو چاہیے تھا کہ اضافہ شدہ اشعار اور ان کے مآخذ کی نشان دہی کرتے۔

اس کتاب پر مالک رام نے محض ایک صفحے کا دیباچہ لکھا ہے جو ناکافی ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے غالب کی جو مفصّل سوانح لکھی تھی، اسے علاحدہ کر کے "ذکرِ غالب" کے نام سے چھاپ دیا۔ "سبد چین" کی تیسری اشاعت وزیرالحسن عابدی نے لاہور میں ۱۹۶۹ء میں کی۔

دستنبو

صد سالہ یادگارِ غالب کمیٹی دلّی نے فروری ۱۹۶۹ء میں غالب کی تصنیف "دستنبو" شائع کی۔ اس میں کسی مرتّب کا نام نہیں دیا۔ رشید حسن خان کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ یہ مالک رام صاحب کی مرتّبہ تھی، گو اس پر ان کا نام درج نہیں تھا۔ میں نے اس کی تصدیق اور تفصیل کے لیے مالک رام کو لکھا۔ انھوں نے ۵ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو یک خط میں مجھے یہ معلومات دیں:

> "صد سالہ تقریبات کے موقع پر 'دستنبو' کا جو ایڈیشن شائع ہوا، وہ میرا ہی مرتّب کردہ تھا اور اس کے متن کی تصحیح میں بہت محنت کرنا پڑی تھی، لیکن چونکہ میں نے اس پر نہ مقدمہ لکھا تھا، نہ کچھ اور اضافہ کیا، میں نے اپنا نام اس پر نہیں دیا تھا ـــ 'دستنبو' کے متن کے تعین کے لیے میرے پاس غالب

کی زندگی کے دونوں ایڈیشنوں کے علاوہ کلیاتِ فارسی نثر کا مکمل ایڈیشن اور ایک قلمی نسخہ تھے۔ یہ آخری نسخہ غالب کا اپنا نسخہ تھا"۔

مالک رام نے متن کی تصحیح میں اتنی محنت کی۔ یہ انھیں کی خاکساری ہے کہ چونکہ اس پر کوئی مقدمہ نہیں لکھا تھا، اس لیے اپنے نام کو مٹا دیا۔ "مالک رام، ایک مطالعہ" اور "مالک نامہ" کے آخر میں حبیبہ بانو کی مرتّب کردہ جو "توقیتِ مالک رام" دی ہے، اس میں مرتّب کردہ کتابوں کی فہرست ہے۔ ان میں "دستنبو" شامل نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ فہرست مالک رام صاحب کے مشورے سے تیار کی گئی ہوگی، اس میں انھوں نے "دستنبو" اور "یادگارِ غالب" کو شامل نہ ہونے دیا۔

ان کی مرتبہ "دستنبو" کے شروع میں شیونرائن آرام کے مطبعِ مفیدِ خلائق آگرہ کی طبعِ اوّل کا سرورق ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ یہ ایڈیشن "دستنبو" کی طبعِ اوّل کا عکس ہے، حالانکہ ایسا نہیں۔ طبعِ اوّل میں قصیدۂ برگزیدہ ابتدا میں ہے اس کے بعد متن شروع ہوتا ہے، طبعِ دوم میں متن کے بعد قصیدہ اور پھر قطعہ درمیانِ روشنیِ دہلی ہے۔ مرتّب کو دیباچے میں واضح کرنا چاہیے تھا کہ وہ "دستنبو" کے کس ایڈیشن کو پیش کر رہے ہیں۔ میرے استفسار پر کالی داس گپتا رضا نے مجھے بتایا کہ مالک رام کے پاس "دستنبو" کا ایک بیش بہا مخطوطہ تھا جس کے حواشی بلاشبہ غالب کے قلم سے ہیں۔ اب یہ نسخہ کالی داس گپتا کے پاس آگیا ہے۔ مالک رام کے ایڈیشن میں اسی کی ترتیب برقرار رکھی ہے۔ ان کے ایڈیشن میں سرورق کے بعد کے صفحے پر چند سطور میں مصنّف (غالب) کا نام، تخلص، ولادت و وفات اور مدفن اور اس کے نیچے غالب کی تصانیف، اردو، فارسی اور انتخابات کے نام ہیں۔ ان میں کچھ ایسے مجموعے شامل ہیں جو بیسویں صدی میں مرتّب ہوئے۔ مالک رام نے محض ان مجموعوں کے نام دیے ہیں، مرتّبین کے نہیں۔ ایسے مجموعے حسبِ ذیل ہیں جن کی تفصیل میں قوسین میں درج کرتا ہوں:

مکاتیبِ غالب (مرتبۂ مولانا عرشی، ۱۹۳۷ء)۔ نادراتِ غالب (مرتبۂ آفاق حسین آفاق

کراچی، ۱۹۳۹ء)۔ انتخابِ غالب (عبدالرزاق راشد، حیدرآباد، ۱۹۲۶ء)۔ انشائے غالب (غیر مطبوعہ، مرتبۂ غالب، ۱۸۹۵ء کے لگ بھگ، نسخۂ مملوکۂ عبدالستار صدیقی)۔ (۲):

ان میں سے بعض مجموعوں کے ساتھ مرتب کا نام یا دیگر تفصیلات نہ دی جائیں تو انھیں کون شناخت کر سکتا ہے، مثلاً رقعاتِ غالب، انتخابِ غالب، انشائے غالب کو۔ اردو تصنیفات میں "نکاتِ غالب" و "رقعاتِ غالب" کو بھی شامل کیا ہے۔ دونوں کے نام کے بیچ "کاما" لگانا سہو کاتب ہونا چاہیے۔ یہ دو علاحدہ رسالے ہیں جنھیں غالب نے ایک ساتھ فروری ۱۸۶۷ء میں شائع کرایا۔ معین الرحمان کی کتاب سے ان کا تعارف درج کیا جاتا ہے:

"نکاتِ غالب" ۲۰ صفحے، "پنج آہنگ" کے آہنگِ دوم کا اردو ترجمہ معمولی تبدیلیوں کے ساتھ "رقعاتِ غالب" ۱۶ صفحے، "پنج آہنگ" سے منتخب ۱۵ فارسی خطوط (ص ۳۴۴)۔

چونکہ یہ دونوں رسالے "پنج آہنگ" سے ماخوذ ہیں، اس لیے مختصر فہرست میں ان کے نام دینے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اگر نام دینے ضروری تھے تو "رقعاتِ غالب" کو اردو کے نہیں، فارسی کے ذیل میں دینا تھا۔ اگر حیاتِ غالب کے بعد کے چند مجموعوں کے نام دیے ہیں تو ایسے دوسرے مجموعوں کے بھی دینے چاہییں، مثلاً:

"متفرقاتِ غالب"، مرتبۂ سید مسعود حسن رضوی، رام پور، ۱۹۴۷ء۔ "فرہنگِ غالب" مرتبۂ مولانا عرشی، ۱۹۴۷ء۔ "آثارِ غالب" (بعد میں نام "مآثرِ غالب") از قاضی عبدالودود ۱۹۴۹ء۔ "غالب کی نادر تحریریں" از خلیق انجم، ۱۹۶۱ء۔

دراصل کتاب کے شروع میں دو چار صفحوں کا دیباچہ ضروری تھا جس میں غالب کی دوسری تصانیف نہ دے کر "دستنبو" کی شانِ نزول بیان کی جاتی۔ متنِ کتاب کی شروعات ایک شعر سے ہوتی ہے جو یوں چھپا ہے:

بنامِ خداوندِ پیروز گر
مہ و مہر ساز و روز و شب گر

دوسرا مصرع وزن اور قافیے دونوں کے اعتبار سے ناقص ہو جاتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یوں ہونا چاہیے: "مہ و مہر ساز و شب و روز گر"۔ میرے استفسار پر کالی داس گپتا نے اپنے مکتوب مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۹۳ء میں بتایا کہ تمام مطبوعہ اور قلمی نسخوں میں "شب و روزگر" ہی ہے۔ مرتب یا کاتب کے سہو سے صدیقی کے ایڈیشن میں یہ "روز و شب گر" چھپ گیا۔ کتاب کے سرورق پر اس کی زبان کے لیے لکھا ہے "بزبانِ فارسی قدیم بے آمیزشِ لفظِ عربی"۔ مالک رام نے "ذکرِ غالب" طبعِ دوم میں "دستنبو" کی خصوصیات میں یہ بات دہرا دی۔ قاضی عبدالودود نے اپنے تبصرے میں مالک رام سے پوچھا کہ وہ الفاظِ ذیل کا خالص پارسی ہونا ثابت کریں:

جلو ۱۰، ماتم ۱۱، بسمل ۱۳، تمغا ۱۴، بام ۱۶، اردو ۱۸، میگزین ۱۹، جزیر ۲۷، قماش ۲۹، یورش ۳۰، نوکری ۳۰، تاراج ۷۹ (اردو تحقیق اور مالک رام، ص ۲۱)۔

معین الرحمان مطلع کرتے ہیں کہ سید جمیل الدین نے اپنے چار قسطی مقالے "دستنبو کا ایک خاص نسخہ" میں کچھ عربی کلمات کی مثال دی ہے:

ماتم، زمزمہ، شرر، صاحب، قلعہ، کیسہ، غوغا، خنجر۔

ان میں سے بعض الفاظ بظاہر فارسی کے ہیں لیکن ان کی اصل عربی ہے۔

مالک رام نے "ذکرِ غالب" طبعِ پنجم میں پہلی دو اشاعتوں کے بیان میں ترمیم کر کے یوں لکھا:

> "اس میں انھوں نے ٹھیٹ پارسی زبان لکھنے کی کوشش کی ہے جس میں عربی کا کوئی لفظ استعمال نہ ہو، سوائے ناموں کے کہ انھیں جوں کا توں لکھنے پر وہ مجبور تھے۔ پھر بھی بعض عربی لفظ آگئے ہیں، مثلاً زمزمہ، صاحب، ماتم، ہوا، نواب، نادر، شکوہ وغیرہ"۔ (ص ۱۳۹)

بہتر ہوتا کہ یہاں مالک رام اعتراف کر لیتے کہ انھوں نے ان الفاظ کی شناخت کن کے تبصروں کے بعد کی ہے۔

قدیم فارسی کی پابندی کی وجہ سے اس کتاب میں بہت اجنبی الفاظ استعمال کرنے

پڑے ۔ مالک رام کے ایڈیشن میں ہر صفحے کے فٹ نوٹ میں ایسے چند الفاظ کے معنی درج کر دیے ہیں ۔ حیاتِ غالب کے " دستنبو" کے ایڈیشنوں میں یہ فرہنگ نہ تھی کلیاتِ نثرِ غالب" ۱۸۶۸ء میں جو " دستنبو" شامل تھی ۔ اس میں پہلی بار چار صفحوں پر " دستنبو " کے مشکل الفاظ کی فرہنگ ملتی ہے (معین الرحمان ۔ ص ۱۴۰) ۔ کالی داس گپتا رضا نے مجھے بتایا کہ کلیات میں فرہنگ متن کے آخر میں ہے اور حروفِ تہجی کے اعتبار سے ہے، جبکہ مالک رام کے مخطوطہ " دستنبو" میں ہر مشکل لفظ کے معنی متن کے ساتھ حاشیے ہی میں بخطِ غالب درج ہیں ۔ مالک رام نے اسی کی نقل کی ہے ۔ اس طرح محسوس ہوتا ہے کہ مالک رام کو ایک دیباچہ لکھ کر کئی امور واضح کرنے چاہییں تھے ۔ انھوں نے " دستنبو" پر الگ سے ایک مضمون لکھا جو " آج کل" فروری ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا ۔ بعد میں یہ ان کے مجموعے " تحقیقی مضامین" ۱۹۸۴ء میں شامل ہوا ۔ اسی کو قدرے اضافے کے ساتھ اپنے ایڈیشن کا دیباچہ بنا سکتے تھے ۔ اس مضمون میں " دستنبو" کے کئی ایسے بیانات کی طرف توجہ دلائی ہے جو صحیح نہیں اور جنھیں غالب نے قصداً رنگ آمیزی کر کے بیان کیا ہے ۔

کلیاتِ غالب فارسی یا دیوانِ غالب فارسی غیر مطبوعہ

مالک رام نے اپنے مجموعے " تحقیقی مضامین" کے پہلے مضمون ' غالب کے فارسی قصیدے (کچھ نیا کلام)' کی ابتدا ان جملوں سے کی ہے :

> " بہت دن ہوئے میں نے غالب کا فارسی دیوان مرتب کیا تھا ۔ اس کے لیے میں نے گیارہ نسخے استعمال کیے تھے ۔ نو (۹) خطی اور دو ان کی زندگی کے مطبوعہ نسخے ۔ افسوس کہ ایک مرحوم مہربان کے کرم کے صدقے یہ شائع نہ ہوا ۔ خیر، یہ دوسرا قصہ ہے" ۔ (ص ۱۱)

میں نے نومبر ۱۹۸۶ء میں ایک ملاقات میں مالک رام سے دریافت کیا کہ آپ اپنی مرتبہ کلیاتِ غالب فارسی " کیوں نہیں شائع کرتے ۔ انھوں نے انکشاف کیا کہ ایک زمانہ ہوا قاضی عبدالودود ان کا مرتب کردہ مسودہ یہ کہہ کر لے گئے کہ وہ اسے شائع

کر دیں گے۔ اس کی چند غزلیں شائع کیں، اس کے بعد خاموش ہو گئے۔ دس سال بعد مسودہ اس شکل میں واپس کیا کہ اس کے بیچ میں سے ۳۰ اوراق (یا صفحات) غائب تھے۔ ستم یہ تھا کہ معذرت یا افسوس کا ایک لفظ نہ لکھا۔ مالک رام کہتے تھے کہ اب میری ہمت نہیں کہ جملہ مآخذ فراہم کر کے ازسرِ نو ان اوراق کو ترتیب دوں۔ ناقص الاوسط کتاب کو شائع نہ کر سکتے تھے۔

ایک محقق سے امید کی جاتی ہے کہ وہ مخطوطات، بالخصوص دوسروں کے مسودات کی دل و جاں سے حفاظت کرے گا نہ کہ کمالِ بے نیازی سے انھیں تلف ہونے دے گا۔ مالک رام کا ظرف دیکھیے کہ کسی تحریر میں اس ادبی اتلاف کا شکوہ تو درکنار، ذکر بھی نہیں کیا۔ معلوم نہیں، اب یہ ناقص الاوسط نسخہ کہاں ہے، کم از کم کالی داس گپتا کو نہیں ملا۔

اردو فارسی مشترک تدوین

گلِ رعنا

غالب نے کلکتے میں اپنے اردو فارسی کلام کا انتخاب "گلِ رعنا" کے نام سے کیا تھا لیکن وہ گم ہو گیا۔ حسرت موہانی کے پاس کچھ اوراق تھے، لیکن ۱۹۵۱ء میں ان کے انتقال کے بعد ان کا بھی کچھ پتا نہ چلا۔ ۱۹۵۷ء میں مالک رام کو اس کا مکمل نسخہ اپنے افسرِ اعلا سید نقی بلگرامی سے ملا۔ یہ عماد الملک سید حسین بلگرامی کے پوتے تھے اور یہ مخطوطہ حیدر آباد میں عماد الملک کے کتب خانے میں تھا۔ عماد الملک کے دادا مولوی سید کرم حسین کلکتے میں شاہِ اودھ کی طرف سے گورنر جنرل کے یہاں سفیر تھے۔ غالب نے چکنی ڈلی کا قطعہ انھیں کی فرمائش پر کہا تھا۔

عرشی صاحب نے مالک رام سے اس نسخے کا عکس لے کر اپنے مرتبہ نسخۂ عرشی (۱۹۵۸ء) کے مقدمے میں اس کا تعارف کرایا اور اختلافِ نسخ کے لیے اس کے متن کا بھرپور استعمال کیا۔ مالک رام نے "نگار" جولائی ۱۹۶۰ء میں اس کے فارسی حصے کا اور

"مذبِ ذاکر" ۱۸۶۸ء میں اس کے اردو حصے کا تعارف کرایا۔ حسنِ اتفاق سے ۱۹۶۹ء اور اس کے کچھ بعد لاہور میں "گلِ رعنا" کے دو مکمل نسخے اور ایک ناقص انتخاب دریافت ہو گئے۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ "گلِ رعنا" کا مکمل نسخہ بخطِ غالب ۱۸۲۸ء، مملوکۂ خواجہ محمد حسن۔ ڈاکٹر سید معین الرحمان نے اپنی کتاب "اشاریۂ غالب" (فروری ۱۹۶۹ء) میں اس نسخے کا تعارف اور چار متفرق صفحوں کا عکس شائع کیا۔ بعد میں یہ دونوں چیزیں "نقوش"، غالب نمبر حصۂ دوم، اکتوبر ۱۹۶۹ء میں بھی شائع ہوئیں۔ مخطوطے کے دیباچے کے آخر میں تاریخ غرہ ربیع الاول ۱۲۴۴ھ پڑی ہے، یہ مطابق ہے ۱۱ ستمبر ۱۸۲۸ء کے۔ یہی "گلِ رعنا" کی تاریخ تالیف قرار پاتی ہے۔ ("غالب کا علمی سرمایہ"، ص ۲۸۳-۲۷۹)

۲۔ دوسرا مکمل نسخہ صفیر بلگرامی کے پوتے وصی احمد بلگرامی کے پاس تھا۔ انھوں نے اسے مشفق خواجہ کو دے دیا جنھوں نے اس کی ترتیب کا کام سید قدرت نقوی کے سپرد کیا۔ نقوی صاحب نے اس کا تعارف رسالہ "اردو" کراچی شمارہ جنوری تا مارچ ۱۹۷۱ء میں کرایا۔ بعد میں اس کا متن انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان سے ۱۹۷۵ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔

۳۔ ناقص اور ناتمام نسخہ مملوکۂ حکیم محمد نبی خاں جمال سویدا (نبیرۂ حکیم اجمل خاں) مکتوبۂ قاضی عزت اللہ دہلوی۔

میرے علم کی حد تک "گلِ رعنا" کے مطبوعہ ایڈیشن تین ہیں:

۱۔ مرتبۂ مالک رام دہلی، مئی ۱۹۷۰ء

۲۔ مرتبۂ وزیر حسن عابدی، لاہور۔ اس پر تاریخ طباعت دسمبر ۱۹۶۹ء درج ہے لیکن اس کی واقعی اشاعت ۱۹۷۰ء کے آخر میں ہوئی (معین الرحمان، ص ۵۴۰)۔ معین الرحمان کے مطابق یہ کسی خاص نسخے پر مبنی نہیں بلکہ کئی جگہ سے استفادہ کر کے تیار کیا گیا ہے۔

۳۔ مرتبۂ سید قدرت نقوی۔ یہ وصی احمد بلگرامی کے نسخے کو پیش کرتا ہے۔ یہ اولاً رسالہ "اردو" جنوری تا مارچ ۱۹۷۱ء سے قسط وار چھپنا شروع ہوا۔ ۱۹۷۵ء میں یہ کتابی

صورت میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر سید معین الرحمان نے اپنی کتاب "غالب کا علمی سرمایہ" میں اس نسخے کی تفصیل ص ۳۷۵ سے ۳۹۱ تک دی ہے۔ ان کے بقول انھوں نے اس کے محض چار صفحے "اشاریۂ غالب" اور "نقوش" میں طبع کرائے تھے۔ انھوں نے بقیہ متن کی طباعت کا ذکر نہیں کیا، لیکن مالک رام اپنے "گلِ رعنا" کے مقدمے میں نسخۂ محمد حسن کے لیے لکھتے ہیں:

"حسنِ اتفاق سے اس کے متن کے مطبوعہ صفحات مجھے اس کتاب کے مطبع میں بھیجے جانے سے پہلے دیکھنے کو مل گئے چنانچہ حواشی میں جہاں حرف 'ل' ہے، اس سے یہی قلمی نسخۂ لاہور کے مطبوعہ صفحات مراد ہیں"۔

(مقدمہ "گلِ رعنا"، ص ۳۳)

اختلافِ نسخ کے حواشی میں اس نسخے "ل" کا اس کثرت سے حوالہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے پورا متن شائع ہوا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ مالک رام نے وزیرالحسن عابدی ایڈیشن کے مطبوعہ صفحات دیکھے ہیں اور انھیں خواجہ محمد حسن کے نسخۂ بخطِ غالب کی مطبوعہ شکل سمجھ لیا ہے، لیکن معین الرحمان کے مطابق ایسا نہیں ہے۔ کالی داس گپتا کے مطابق بھی خواجہ محمد حسن کا نسخہ شائع نہیں ہوا۔ اب صورتِ حال یہ ہوئی کہ "گلِ رعنا" کا مکمل نسخہ سب سے پہلے مالک رام کے ہاتھ لگا، لیکن اس کا تعارف اور اشعار کی تفصیل عرشی صاحب نے نسخۂ عرشی ۱۹۵۸ء میں پیش کی۔ "گلِ رعنا" کی اشاعت دہلی اور لاہور دونوں جگہوں سے ۱۹۷۰ء میں ہوئی گو عابدی کے ایڈیشن میں تاریخ اشاعت دسمبر ۱۹۶۹ء درج ہے۔ اگر مالک رام ۱۹۵۷ء سے بارہ تیرہ سال تک اس نسخے کو لیے نہ بیٹھے رہتے تو اس کے تعارف اور اشاعت کی اوّلیت کا فخر انھیں مل سکتا تھا۔

مالک رام کے حیدرآبادی نسخے کے شروع میں جو فارسی نثری دیباچہ ہے، اس کے آخر میں تاریخ کتابت یوں دی ہے: "محررۂ، نہم شوال ۱۲ ہجری" گویا صدی کا عدد ہے دہائی اور اکائی کے نہیں۔ اب مالک رام صاحب سنین جس طرح طے کرتے ہیں، ان کا

خلاصہ یہ ہے:

چونکہ کرم حسین کلکتے میں غالب کے ہم نشین تھے، اس لیے غالب نے "گلِ رعنا" جیوں ہی مرتب کی ہوگی، انھوں نے اس کی نقل لے لی ہوگی۔ خواجہ محمد حسن کے نسخے کے آخر میں تاریخ غرہ ربیع الاول ۱۲۴۴ھ (یعنی ۱۱ ستمبر ۱۸۲۸ء) درج ہے۔ نسخۂ مالک رام کے کاتب نے اپنی کتابت کی تاریخ لکھنی چاہی ہوگی نہ کہ نسخۂ منقول عنہ کی۔ اگر میرا قیاس درست ہو تو یہ زیرِ نظر نسخہ شوال ۱۲۴۴ھ کا کتابت کردہ ہے۔ سال تحریر کی عدمِ تکمیل غالباً نتیجہ ہے کاتب کے سالِ ہجری سے ناواقفیت کا"
(مقدمہ، ص ۲۰)

اب دوسری طرف کاتب نے قلمی نسخے کے خاتمے کی نثر کے اختتام میں لکھا ہے:
"محرر اسداللہ، محررۂ دوم محرم الحرام" اور اس کے بعد جلی عنوان ہے "خاتمۂ دیوانِ فارسی" لیکن اس کے آگے خاتمۂ دیوانِ فارسی کی عبارت نہیں دی (مقدمہ، ص ۲۰)۔
پنج آہنگ" مطبوعہ ۱۸۵۳ء اور "کلیاتِ نثرِ غالب" مطبوعہ ۱۸۶۸ء، دونوں میں یہی صورت ہے کہ "گلِ رعنا" کے خاتمے کی نثر کے بعد یہی الفاظ ملتے ہیں: "محرر اسداللہ، محررۂ دوم محرم الحرام، خاتمۂ دیوانِ فارسی" (معین الرحمان، ص ۵۲۸)۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ کاتب نے "گلِ رعنا" کے خاتمے کی فارسی نثر کلیاتِ نثر کے کسی قلمی یا مطبوعہ نسخے سے نقل کی ہے۔ مالک رام کہتے ہیں: "چونکہ کلیاتِ نثرِ فارسی کے کسی نسخے میں گلِ رعنا کا متن نہیں ملتا، اس لیے یہ قیاس درست نہیں ہوگا"۔ (مقدمہ، ص ۲۰)
مالک رام اس فقرے "خاتمۂ دیوانِ فارسی" کی کوئی تاویل نہ کر سکے اور بات بیچ اُدھر میں چھوڑ دی۔ سید قدرت نقوی نے رسالہ "اردو" کراچی شمارہ ۱، ۱۹۷۱ء میں مالک رام کے مخطوطے کی تاریخ شوال ۱۲۴۴ھ پر اعتراض کیا۔ یہ معیناً ۱۸۲۹ء میں آتا ہے۔ غالب کا دیوانِ فارسی پہلی بار "مے خانۂ آرزو سرانجام" کے نام سے ۱۲۵۱ھ میں مرتب ہوا۔

ڈاکٹر معین الرحمان کہتے ہیں کہ "گلِ رعنا" کے نسخۂ بخطِ غالب (نسخۂ محمد حسین) اور مالک رام کے نسخے کے اختلافات کے پیشِ نظر یہ طے ہو جاتا ہے کہ نسخۂ مالک رام غالب

کے خطی نسخے کی نقل نہیں ، اگر ہوتا بھی تو یہ کیوں لازم ہے کہ نسخۂ مالک کے کاتب نے لازماً اسی سال ۱۲۴۴ھ میں نقل کیا۔ اگر اس سے نقل کرتا تو اس کے سالِ ہجری سے ناواقفیت کا کیا سوال ہے۔ اس کے علاوہ اُن دنوں معاشرے میں ہجری سنہ ہی رائج تھا۔ کاتب اس سے ناواقف کیونکر ہو سکتا تھا (علمی سرمایہ ، ص ۵۲۴)۔ سید قدرت نقوی نے رسالہ " اردو " کراچی شمارہ ۱ ، ۱۹۷۱ء میں مالک رام کے نسخے کی تاریخ شوال ۱۲۴۴ھ قبول نہیں کی اور اس کے رد میں مختلف دلائل دیے جن سے معین الرحمان بھی کم و بیش متفق ہیں۔

کاتب نسخۂ مالک خاتمے میں " خاتمۂ دیوانِ فارسی " کا فقرہ لکھتا ہے۔ یہ دیوان سب سے پہلے ۱۸۳۵ء میں مرتّب ہوا۔ یہ پکّا ثبوت ہے اس بات کا کہ نسخۂ مالک رام ۱۸۳۵ء یا اس کے بعد کا مکتوبہ ہے۔ " گلِ رعنا" کے اصلی خطّی نسخے بخطِ غالب کی نثرِ خاتمہ اور نسخۂ مالک کی نثرِ خاتمہ میں بہت اختلاف ہے۔ نسخۂ مالک کی نثرِ خاتمہ لفظ بہ لفظ " پنج آہنگ" اور " کلیاتِ نثرِ غالب" میں مشمولہ نثرِ خاتمہ سے ملتی ہے ، اس لیے یہ انھیں کے قلمی یا مطبوعہ نسخے سے نقل کی گئی ہو گی ، یا پھر " گلِ رعنا" کا کوئی ایسا نسخہ ہو سکتا ہے جس میں " خاتمۂ دیوانِ فارسی" کا جلی عنوان لکھ دیا ، اس کے آگے نقل کرنے سے روک دیا گیا ہو گا (علمی سرمایہ ، ص ۵۲۶)۔ اس طرح اس نسخے کی کتابت ۱۸۳۵ء اور ۱۸۸۲ء کے بیچ کسی وقت ہوئی ہو گی۔ ۱۲۹۹ھ مطابق ہے ۱۸۸۲ء کے (ایضاً ص ۵۲۹-۵۳۰)۔

سید قدرت نقوی کے دلائل وزنی ہیں۔ سید قدرت نقوی نے مالک رام پر فتورِ نیت کا الزام لگایا ہے کہ انھوں نے قصداً اپنے نسخے کو نسخۂ غالب کی نقل اور اسی عہد کا کتابت شدہ قرار دیا (ایضاً ص ۵۲۵)۔

مالک رام کا مخطوطہ " گلِ رعنا" اب کالی داس گپتا رضا کی ملکیت ہے۔ میرے استفسار پر انھوں نے اس کے بارے میں حسبِ ذیل اہم معلومات بہم پہنچائیں۔

میری رائے میں اس مخطوطے میں دیباچہ اور انتخابِ کلام اردو و فارسی غالب کے زیرِ نظر تیار کی گئی آخری روایت کی نقل ہے۔ یہ نقل ۱۸۳۵ء کے بعد پایۂ تکمیل کو

پہنچی مگر روایت اس سے بہت پہلے مرتب ہو گئی ہو گی، کیونکہ:

۱۔ اس میں کچھ اشعار بڑھا دیے گئے ہیں اور کچھ کم کر دیے گئے ہیں پہلی روایتوں سے۔

۲۔ اس میں "آشتی نامہ" اور خاتمۂ "گلِ رعنا" شامل نہیں کیے گئے۔ قیاس ہے کہ غالب ان ہر دو کو شامل کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔

۳۔ اس میں دیباچہ کہیں کہیں وہ نہیں ہے جو "پنج آہنگ" قلمی میں ہے (کیونکہ یہ دیباچہ "گلِ رعنا" مشمولہ "پنج آہنگ" قلمی کی نقل نہیں ہے بلکہ غالب کا ترمیم کردہ آخری متن ہے)۔

۴۔ نقل کرنے والے نے جب یہ مخطوطہ تیار کیا تو آخر میں خاتمۂ "گلِ رعنا" بھی پنج آہنگ" قلمی کو سامنے رکھ کر نقل کر دیا، کیونکہ مخطوطے کے خاتمۂ "گلِ رعنا" کا حرف حرف "پنج آہنگ" قلمی کے خاتمۂ "گلِ رعنا" کے مطابق ہے۔ اس کے بعد جیسا کہ "پنج آہنگ" قلمی میں ہے، اس نے عنوان "خاتمۂ دیوانِ فارسی" لکھا ہی تھا کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے قلم وہیں روک دیا۔

۵۔ جب معین الرحمان اور قدرت نقوی کے مضامین شائع ہوئے تو میں نے ایک دفعہ مالک رام سے گفتگو کی تھی اور کہا تھا کہ بہت باریکی سے دیکھنے کے بعد نہم شوال ۱۲ھ کے بعد بہت دھندلا سا ۵۶ھ لکھا ہوا لگتا ہے اور ہو نہ ہو، یہ مخطوطہ نہم شوال ۱۲۵۶ھ کو لکھا گیا ہو گا یعنی نقل کیا گیا ہو گا۔ انھوں نے جنتری صد سالہ نکالی اور کہا کہ "یہ ٹھیک معلوم ہوتا ہے، اس روز جمعہ بھی تھا"۔ یہ مطابق ہوا ۴ دسمبر ۱۸۴۰ء کے (میرے نام مکتوب، مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۹۳ء) اس خط سے دو مفید معلومات ملتی ہیں:

۱۔ مالک رام کا مخطوطہ "گلِ رعنا" مخطوطۂ خواجہ محمد حسن کے بعد کی وہ ترمیم شدہ روایت ہے جو خود غالب نے تیار کرائی۔

۲۔ یہ مخطوطہ ۴ دسمبر ۱۸۴۰ء کا مکتوبہ معلوم ہوتا ہے۔

مالک رام کا "گلِ رعنا" کا ۳۵ صفحوں کا مقدمہ بہت سیر حاصل ہے۔ اس کی ابتدا میں غالب کے قیامِ کلکتہ، وہاں کے ادبی ماحول اور صاحبِ فرمائش "گلِ رعنا"

سراج الدین احمد کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد اپنے نسخے کی دریافت، نیز سید نقی بلگرامی کے دادا کے دادا سید کرم حسین کے حالات ہیں، پھر نسخے کی تفصیل ہے۔ مقدمے کی فصل نمبر ۸ میں مالک رام نے کئی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا اور بتایا کہ غالب نے "اسد" تخلص چھوڑ کر "غالب" تخلص کب اختیار کیا۔ آزاد نے جو لکھا ہے کہ غالب کے متداول دیوان کو مولوی فضلِ حق اور مرزا خانی کوتوالِ شہر دہلی نے انتخاب کیا، اسے مالک رام افسانہ طرازی قرار دیتے ہیں کیونکہ مولوی فضل حق فاضلِ دینیات تھے، فاضل ادب نہیں۔ مرزا خانی کوتوالِ شہر قتیل کے شاگرد تھے۔ انتخاب خود غالب نے کیا۔ آزاد نے غالب کو مطعون کرنے کے لیے یہ افسانہ گڑھا تھا۔ مالک رام نے یہی بات اپنے مضمون "دیوانِ اردو کی کہانی" مشمولہ "گفتارِ غالب" میں دہرائی ہے۔

بعض نقاد اس بات پر مُصر ہیں کہ غالب ابتدا میں مشکل خیالات مشکل زبان میں ادا کرتے تھے، بعد میں میر کے اثر سے آسان گوئی اختیار کی۔ یہ بات حقیقت کے خلاف ہے۔ مالک رام نے ان کی متعدد مشہور آسان غزلوں کی نشان دہی کی جو ابتدائی مخطوطوں میں موجود ہیں یعنی آغازِ مشق کی تصنیف ہیں۔ یہی بات انھوں نے اپنے مضمون "میر اور غالب" مشمولہ "گفتارِ غالب" میں کہی۔ اس قابلِ قدر مقدمے کے بعد "گل رعنا" کا متن ہے۔ متن کے شروع اور آخر میں غالب کی فارسی نثر ہے۔ اس کے بعد مرتب نے مفصل حواشی لکھے ہیں۔ ان کی جامعیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ غالب کے چار صفحاتی فارسی دیباچے سے متعلق ۸۰ حواشی ہیں۔ کل حاشیے خفی کتابت کے ۲۴ صفحات کو محیط ہیں۔

رسالہ "تحریک" میں ایک مضمون نگار نے "گل رعنا" میں منقول دو اشعار کی غیر موزونیت پر اعتراض کیا تھا، حالانکہ یہ یقیناً سہوِ کتابت تھا۔ (۴)

(الف)

مرحبا سوہن و جاں بخشی اش غالب
خندہ بر گریہ خضر و سکندر دارم
(مقدمہ "گل رعنا" ص ۲۷)

سوہن سے بہار کی ندی سون مراد ہے جو ہر سال سیلاب میں نمایاں ہوتی ہے۔ یہ شعر مقدمے کے علاوہ "گلِ رعنا" کے متن میں ص ۲۸ پر بھی ہے اور وہاں پہلے مصرع کا متن یوں دیا ہے:

مرحبا سوہن و جاں بخشئ آبش غالب

ایسا نہیں ہو سکتا کہ معترض نے مقدمے میں وہ غیر موزوں اور مبہم مصرع دیکھ کر صحیح لفظ جاننے کی کوشش نہ کی ہو، اس نے متن میں دیکھ لیا ہو گا، لیکن چونکہ اعتراض کرنا مقصود تھا اس لیے مقدمے کے سہوِ کتابت پر گرفت کر لی اور متن کے صحیح مصرع کی بات گول کر دی۔

(ب)

سن کر ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

(گلِ رعنا، ص ۷۰)

"کر" سہوِ کتابت ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اس مشہور شعر میں "سن کے ستم ظریف ــــ الخ" ہے چنانچہ مالک رام صاحب کے مرتبہ آزاد کتاب گھر کے دیوانِ غالب نیز صدی ایڈیشن دونوں میں "سن کے" ہی دیا ہے۔

ان دونوں اغلاطِ کتابت سے قطعِ نظر، یہ کہنا نامناسب نہ ہو گا کہ "گلِ رعنا" کی ترتیب تدوینِ متن کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ پاکستانی ایڈیشن میری نظر سے نہیں گزرا۔

اردو تدوینات اور ادارت

اس زمرے کے تحت غالب کی تین تصانیف کی تدوین اور غالب سے متعلق ایک مجموعۂ مضامین "عیارِ غالب" کی ادارت آتی ہے۔

دیوانِ غالب

مالک رام صاحب نے غالب کے اردو دیوان کو ترتیب دیا۔ پہلی بار اسے آزاد کتاب گھر دلی نے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔ اس کا کم از کم ایک ایڈیشن اور نکلا۔ میرے سامنے جو نسخہ ہے، اس پر نہ سنہ اشاعت درج ہے، نہ ایڈیشن کی صراحت ہے۔ مقدمے پر ضرور

۱۹۵۷ء درج ہے لیکن سرورق پر "بعد نظر ثانی" لکھا ہے۔ ممکن ہے، یہ دوسرا ایڈیشن ہو، کیونکہ میں نے اس کا پہلا ایڈیشن دیکھا تھا جس میں یہ مبینہ غزل شامل تھی:

پیرانہ سال غالبؔ بے کش کرے گا کیا

بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

اس نسخے میں نہیں، اس طرح یہ دوسرا ایڈیشن ہو سکتا ہے، لیکن مالک رام صاحب کے مرتبہ ایڈیشن پر سنہ اشاعت اور ایڈیشن کی صراحت نہ ہونا تعجب خیز ہے۔ زیر نظر ایڈیشن کے شروع میں ۳۶ صفحات کا مقدمہ ہے، پھر غالب کا ۱۸۳۳ء والا فارسی دیباچہ اس کے آگے نظامی ایڈیشن ۱۸۶۲ء کے مطابق متداول دیوانِ غالب کا متن ہے، اس کے آگے کچھ ایسا کلام ہے جو متداول دیوان میں نہیں بلکہ دوسرے ذریعوں سے لیا گیا ہے۔ سب سے آخر میں ۳۲ صفحات پر نسخۂ حمیدیہ سے لے کر قلم زد کلام کا انتخاب دیا ہے۔ آزاد کتاب گھر کی طبعِ اول غالب کے دیوان کا پہلا تحقیقی ایڈیشن ہے جس میں صحتِ متن کی طرف توجہ کی گئی ہے اور کسی حد تک اختلافِ نسخ دیے ہیں۔ اتفاق سے اس کے ایک ہی سال بعد ۱۹۵۸ء میں عرشی صاحب کا نسخۂ عرشی شائع ہو گیا جس کی وجہ سے مالک رام کا مرتبہ دیوانِ غالب اپنی اہمیت کھو بیٹھا۔

۱۹۶۹ء میں صد سالہ یادگار غالب کمیٹی نے محسوس کیا ہو گا کہ اس موقع پر غالب کی سب سے مقبول تصنیف دیوانِ غالب کا ایک عمدہ ایڈیشن شائع کیا جائے جو صحیح بھی ہو، دیدہ زیب بھی اور قیمت میں ارزاں بھی۔ نتیجے میں مالک رام صاحب کا مرتبہ دیوانِ غالب صدی ایڈیشن ۱۹۶۹ء میں شائع کیا گیا جس کا کاغذ نفیس اور موٹا، کتابت و طباعت دیدہ زیب، جلد مضبوط کریج کی ہے اور اس کے باوجود قیمت صرف پانچ روپے ہے۔ ظاہر ہوا، یہ کوئی تحقیقی ایڈیشن نہیں بلکہ عام قارئین کے لیے ہے۔ اس میں ایک صفحے پر غالب کا تعارف اور تصانیف کی فہرست ہے۔ اس کے بعد صرف دو صفحات کا مقدمہ بنام "تعارف" ہے۔ پھر غالب کا ۱۸۳۳ء کا فارسی دیباچہ ہے جو میری رائے میں غیر ضروری ہے۔ اس کے بعد متداول دیوان کے نظامی ایڈیشن کا متن ہے

لیکن اس میں سولہ شعر زیادہ ہیں ۔ چار شعر " قلم کیا ہے ، قلم کیا ہے" والی غزل میں اور دس شعر سہرے کے ، جو حیرت ہے کہ نظامی ایڈیشن میں نہیں تھا ۔

رشید حسن خاں صاحب نے اس صدی ایڈیشن پر ایک نہایت طویل معترضانہ تبصرہ لکھا جو " تحریک " کے غالب نمبر ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا اور بعد میں " اردو تحقیق اور مالک رام" نام کی کتاب میں آخری بار ان کے مجموعے " ادبی تحقیق ، مسائل اور تجزیہ" (علی گڑھ ، ۱۹۷۸ء) میں قدرے ترمیم کے بعد آیا ۔ میں نے اپنے مضمون میں دیوان غالب کا تبصرہ لکھتے وقت " اردو تحقیق اور مالک رام" ہی پیش نظر رکھی تھی اس لیے یہاں اسی کے صفحوں کا حوالہ دے رہا ہوں ۔

انھوں نے یہ مضمون بڑی دیدہ ریزی کے بعد لکھا ہے ۔ اس سے ان کے عمق نظر کا اندازہ ہوتا ہے ۔ کاش انھوں نے اسے غیر جذباتی رنگ میں لکھا ہوتا اور خامیوں کے بیان کے ساتھ ساتھ مالک رام کے اکتسابات پر سیاہی نہ پھیر دی ہوتی ! مضمون کے یک رخے پن کو نظرانداز کرتے ہوئے میں اس کے بعض مطالب سے متعلق اپنے مشاہدات عرض کرتا ہوں :

۱ ۔ دیوان غالب کے تیسرے (احمدی) ایڈیشن میں بہت اغلاط طباعت تھیں ۔ غالب نے اس کی ایک کاپی کو درست کیا اور اسی سے چوتھا (نظامی) ایڈیشن چھاپا گیا ۔ غالب کی درست کردہ کاپی آصفیہ لائبریری حیدرآباد میں موجود ہے ۔ اس کے آخر میں غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط موجود ہے جس میں تصدیق ہے کہ یہ نسخہ انھوں نے تصحیح کیا ہے رشید حسن خاں کو چونکہ اس نسخے میں غلطیاں باقی دکھائی دیں ، اس لیے ان کا خیال ہے کہ یہ وہ نسخہ نہیں جو غالب نے تصحیح کیا ہو گا ۔ وہ قیاس کرتے ہیں کہ غالب نے تصحیح کسی اور نسخے کی کی ہو گی اور بے خیالی یا سرخوشی میں یا کسی اور سبب سے رقعہ دوسری کاپی پر لکھ دیا (" اردو تحقیق اور مالک رام" ، ص ۵۱) ۔ غالب کی تحریری دستاویزی سند کو قیاس رد نہیں کر سکتا ۔ اگر اس جلد میں اب بھی اغلاط باقی ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ غالب نے توجہ سے تصحیح نہیں کی یا شاید کاتب نے ان کی تمام اصلاحات کو نہیں بنایا جس کی وجہ سے بعض اغلاط باقی رہ گئے ۔ اگر اس میں بعض اصلاحیں پنسل

سے ہیں یا صریحاً بدستِ غیر ہیں تو صاف ہے کہ انھیں غالب کے بعد کسی اور شخص نے درج کیا ہے۔

مالک رام صاحب نے اس نسخے کا مقابلہ حیدرآباد جا کر نہیں کیا بلکہ نصیرالدین ہاشمی صاحب سے کرایا۔ یہ ضرور کوتاہی ہے۔ ہاشمی کو تقابل کا کام سونپا جا سکتا تھا کہ وہ بھی مخطوطات کے ماہر تھے، لیکن بدقسمتی سے وہ غالبیات کے ماہر نہیں تھے۔ وہ شناخت نہیں کر سکتے تھے کہ کون سی اصلاحیں بدستِ غالب ہیں اور کون سی بدستِ غیر۔ مالک رام صاحب خود جا کر دیکھتے تو ان کے فیصلے زیادہ باوثوق ہوتے۔

۲۔ صدی ایڈیشن میں اختلافِ نسخ نہیں دیے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نسخے کو عام شائقینِ غالب کے لیے تیار کیا گیا، محققینِ غالبیات کے لیے نہیں۔ آزاد کتاب گھر والے ایڈیشن میں بعض نہایت ضروری اختلافاتِ نسخ دیے ہیں۔ "صدی ایڈیشن" میں مالک رام نے کہیں کہیں نسخۂ نظامی سے انحراف کیا ہے۔ میں اس کی وجہ نہیں بیان کر سکتا شاید آصفیہ لائبریری کی کاپی میں ایسا ہو۔ جب تک اسے خود نہ دیکھ لوں، نہ مالک رام صاحب کے متن پر اعتراض کر سکتا ہوں نہ رشید حسن خاں کے اعتراض کی تردید۔ رشید حسن خاں "صدی ایڈیشن" کے علاوہ آزاد کتاب گھر کے دیوان کو بھی سامنے رکھ لیتے تو نظامی ایڈیشن سے بعض انحرافات کی وجہ سمجھ میں آسکتی تھی۔ یہ یقینی ہے کہ غالب کی زندگی کے پانچوں ایڈیشنوں میں نظامی ایڈیشن، باوجود اغلاط کے، سب سے زیادہ معتبر ہے۔

یہ واضح رہے کہ مالک رام نے دیوانِ غالب مرتب کرنے کے لیے نسخۂ عرشی کی طرح غیر معمولی کاوش نہیں کی۔ انھوں نے دیوانِ غالب کا کوئی مخطوطہ سامنے نہیں رکھا آزاد کتاب گھر کے ایڈیشن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے معتبر مطبوعات ہی پر انحصار کیا ہے، اس لیے انھیں اپنے مآخذ میں جہاں نظامی ایڈیشن سے اختلاف دکھائی دیا اور دوسرے متن کو نظامی کے متن پر ترجیح دینے کی وجوہ تھیں، وہاں انھوں نے ترجیح دی ورنہ بقیہ سب صورتوں میں نظامی کے متن کو مرجح رکھا، مثلاً

صدی ایڈیشن میں ع: غم گیتی سے مرا سینہ امر کی زنبیل (ص ۲۰۰) میں "امر" کی کوئی صراحت نہیں لیکن آزاد کتاب گھر کے ایڈیشن میں ہے۔ چونکہ مالک رام کو نسخۂ نظامی سے زیادہ معتبر کسی مطبوعہ نسخے میں عمر نہیں ملا، اس لیے انھوں نے "امر" کو برقرار رکھا جو غالباً آصفیہ کی کاپی میں بھی ہے۔

ع: میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح (صدی ایڈیشن ص ۲۰۰، اور آزاد کتاب گھر ایڈیشن ص ۲۴۳) میں نظامی کے برخلاف "ایہام" کو "ابہام" چھاپنے کی وجہ یہ ہے کہ انتخاب غالب میں "ابہام" ہے۔ مالک رام صاحب نے اپنے ایڈیشنوں میں نظامی ایڈیشن سے جہاں جہاں اختلاف روا رکھا ہے، میں ان سب کی توجیہ تو نہیں کر سکتا ہاں، آزاد کتاب گھر کے ایڈیشن کے اختلافِ نسخ سے کہیں کہیں وجہ معلوم ہو جاتی ہے۔

۳۔ رشید حسن خاں نے مطالبہ کیا ہے کہ دیوانِ غالب میں غالب کے املا کی پابندی کی جائے۔ مجھے اس اصول سے شدید اختلاف ہے۔ میں نے نسخۂ عرشی پر مضمون لکھتے ہوئے یہ اصول پیش کیا تھا کہ ترتیبِ متن میں فرسودہ املا کو جدید املا میں بدل دینا چاہیے، سوا ان صورتوں کے جہاں فرسودہ املا تلفظ کے اختلاف کو ظاہر کرتا ہے۔ (۱) اگر غالب کے املا کو مقدس مانا جائے تو کیا یاے معروف و مجہول میں فرق نہ کیا جائے باے ملفوظی و ہاے مخلوط میں التباس کیا جائے؟ مثلاً: "مرقع غالب" مرتبہ پرتھوی چند سے چند مثالیں لیجیے۔ قوسین میں جدید املا دیا تاکہ قاری صحیح پڑھ سکے۔ مرتب نے خطوط کے عکس پر صفحات کے نمبر نہیں دیے، میں نے ڈال دیے ہیں تاکہ حوالہ دیا جا سکے:

نکہوں (نہ کہوں) ص ۱۹۷۔ مین (میں) ص ۱۹۸۔ خشنودی (خوشنودی) ص ۱۹۹۔ بیتوں (بیٹوں) ص ۲۰۲۔ بالفعل (بالفعل) ص ۲۰۳۔ کچہہ (کچھ) ص ۲۰۶۔ ہی (ہے) ص ۲۳۱۔

اگر غالب کے املا کی پابندی کی جائے تو دوسرے قدیم مصنفوں کی جو تحریریں ان کے ہاتھ کی ملتی ہوں، ان کی بھی تقلید کی جائے، اس طرح تمام موجودہ اشاعتیں قدیم

مخطوطات کی طرح ہو جائیں گی۔ ایک مضمون میں غالب کے شعر میں "خرشید" اور نثر میں "بالفعل" اور "خشنودی" لکھا جائے گا، کسی دوسرے شاعر کے شعر میں "خورشید" یا قدیم عبارت میں "بالفعل"، "خشنودی"۔ لکھنے کی غرض یہ ہے کہ غالب کا املا غالب کے زمانے کے لیے تھا۔ آج اس کی تقلید کرنا حال کو ماضی میں بند کرنا ہے۔ جہاں غالب نے "تھنبے" لکھا ہے، وہاں ہم "تھمے" نہیں لکھ سکتے کہ اس سے تلفظ بدل جائے گا، لیکن اگر غالب "خرشید" کو صحیح املا قرار دیتے ہیں تو دیں۔ ہم اگر دوسری تحریروں میں رائج الوقت املا "خورشید" لکھتے ہیں تو دیوانِ غالب کی اشاعت میں بھی "خورشید" لکھنا چاہیے۔

رشید حسن خان نے واضح کیا کہ عربی لفظ "جیب" بمعنی گریبان مذکر ہے۔ غالب کے اشعار میں یہ لفظ گریبان ہی کے معنی میں آیا ہے، اس لیے اسے مذکر لکھنا چاہیے یعنی ہمارے جیب (۷)، لیکن جب رشید حسن خان یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ جیب کو عربی کی تقلید میں بہ فتحِ اوّل جَیب لکھا جائے تو میرے مذاقِ شعری کو دھچکا لگتا ہے۔ یہ ایسا ہی مطالبہ ہے جیسا "سوال" کو 'س' کے ضمے سے سُوال، "بیگم" کو 'گ' کے ضمے سے بیگُم اور "موسم" کو 'س' کے کسرے سے موسِم بولنے کا ہو۔ اردو میں جیب لکھنا اور بولنا بالکل مولویانہ تلفظ ہو گا، شاعرانہ نہیں۔ واضح ہو کہ مالک رام نے بھی "گلِ رعنا" (۸) میں اس شعر میں "ہمارے جیب" ہی لکھا ہے (۹) لیکن یہ شاید رشید حسن خان کے اعتراض کو دیکھنے کے بعد کیا ہو۔

۵۔ اشعار کی غیر موزونیت۔

الف۔ غالب کے ان اشعار میں جہاں "ایک" بروزنِ فع آیا ہے، مالک رام کے ایڈیشنوں میں بیش تر "اک" لکھا ہے لیکن کہیں "ایک"۔ وزن کا تقاضا بھی "اک" لکھنے کا ہے اور ایسے موقعوں پر غالب کا فرمان بھی یہی ہے (۱۰)، لیکن میں اپنی ذاتی رائے عرض کرتا ہوں کہ "اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا" جیسے مصرعوں میں عام قاری 'اک' (یاے مجہول کی تخفیف) نہیں بولتا بلکہ یاے مجہول کو مختصر کر کے بولتا ہے۔ ان موقعوں پر "اک" اور "ایک" دونوں میں سے کوئی بھی تلفظ کی صحیح ترجمانی نہیں

کرنا۔ "اک" لکھنے سے حرف علت کا طول صحت سے ظاہر ہوتا ہے لیکن اس کی صوتیاتی نوعیت بدل جاتی ہے۔ "ایک" لکھنے سے حرف علت کی نوعیت صحیح رہتی ہے لیکن اس کا طول بدل جاتا ہے۔ پھر بھی ہم "ایک" لکھا ہونے کی بنا پر ایسے مصرعوں کو غیر موزوں نہیں کہہ سکتے، کیونکہ اردو شعر میں یہ عام رواج ہے کہ طویل حرفِ علت لکھا جاتا ہے لیکن وزن کی خاطر موزوں طبع قاری اسے مختصر کر کے پڑھتا ہے۔ مثلاً غالب کے یہ مصرعے:

ہے نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند
بہ عشق از دو جہاں بے نیاز باید بود
چو لب نہ ہرزہ نوایانِ شوق نتواں شد
کاش کاں بتِ کاشی در پذیردم غالب
بندۂ توام گویم، گویدم زنار آرے
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

نو، دو جہاں، چو لب، توام، مرے میں "و" اور "ے" مختصر ہیں، لیکن انھیں طویل لکھنے کی بنا پر کوئی شعر کو غیر موزوں یا کتابت کو غلط نہیں کہتا۔ کہا جا سکتا ہے کہ لفظ کے آخر میں حرفِ علت کا دبانا عام ہے لیکن لفظ کے درمیان نہیں، لیکن بعض الفاظ میں درمیانی حرفِ علت بھی دبایا جاتا ہے۔ "دو رستہ" کو ہم ایک مرکب لفظ کہیں گے ریختی کا لفظ "دوگانا" بھی واحد ہے۔ اب ذیل کے اشعار دیکھیے:

دو رستہ جو روشن چراغاں ہوئے
لگے خوشی سے غزل خواں ہوئے
(مثنوی "سحرالبیان")

دوگانا، جان کے بچے نے موتا مجھ نمازی پر
مصلائی تر ہوئی ساری، پڑا آدھا بدن دھونا
(جان صاحب)

ریختی کے اشعار میں "دوگانا" کے تلفظ میں ہمیشہ "و" دبائی جاتی ہے اور ہمیشہ

لکھی جاتی ہے، اسے کوئی غیر موزوں نہیں کہتا۔ "دوکان" میں واو لکھ کر بھی ہم اسے "دکان" بولتے ہیں اور اکبر الہ آبادی کا یہ شعر دیکھیے:

شیخ جی کے دونوں لڑکے باہنر پیدا ہوئے
ایک ہیں خفیہ پولیس میں، ایک پھانسی پر چڑھے

لفظ "پولیس" میں واو لکھنے کے باوجود اس کا تلفظ "پلس" کیا جاتا ہے۔ اسی طرح "ایک" لکھا جائے تو بھی ہر موزوں طبع قاری اس کے حرف علت کو سرا، صافہ والے کسرے سے پڑھے گا جو مختصر یائے مجہول کے مترادف ہے۔ بہرحال یہ میرا ذاتی معروضہ ہے۔ اگر غالب "اک" پسند کرتے ہیں تو چونکہ "ایک" (بہ اختصار یا) کا تلفظ "اک" سے مختلف ہے، اس لیے "اک" ہی کو ترجیح دی جائے گی، لیکن "ایک" کے ساتھ بھی مصرع کو غیر موزوں نہیں کہا جا سکتا۔

ب۔ جن اشعار میں وزن کا تقاضا "آئینہ" (فارسی قاعدے سے "آیینہ") لکھنے کا ہے، وہاں "آینہ" لکھنا غلط ہے، اس سے شعر غیر موزوں ہو جاتا ہے۔ صدی ایڈیشن میں یہ سہو بارہا ہوا ہے۔

ج۔ رشید حسن خاں نے واضح کیا ہے کہ غالب "یہاں، وہاں" کے مقابلے میں "یھاں، وھاں" کو فصیح تر مانتے تھے اور اشعار میں یہی باندھا ہے، گو اس زمانے کے املا کے مطابق ان الفاظ کو ہائے مخلوط کی جگہ ہائے ملفوظی سے "یہاں، وہاں" لکھتے ہیں، شعر کا وزن بھی "یھاں، وھاں" کا طالب ہوتا ہے۔ (۱۰) مالک رام صاحب نے ان موقعوں پر بعض اوقات "یہاں، وہاں" چھاپا ہے جو صحیح نہیں۔ نسخۂ عرشی میں ان سب موقعوں پر "یاں، واں" لکھا ہے۔ وہاں بھی "یھاں، وھاں" ہوتا تو بہتر ہوتا گو "یاں، واں" سے وزن تو درست رہتا ہے۔ واضح ہو کہ دلی اور مغربی یوپی میں عام بول چال میں "یھاں، وھاں" ہی بولا جاتا ہے۔

۶۔ اعتراض ہے کہ "ت" اور "ط" میں خلط مبحث کیا ہے۔ "طراز" کو ہمیشہ "ت" سے لکھنا چاہیے کہ یہ فارسی لفظ ہے۔ (۱۱) میں نے نسخۂ عرشی میں دیکھا۔ اتفاق سے وہاں بھی اعتراض کیے ہوئے چاروں مصرعوں میں مالک رام والا املا ہے۔

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز	صدی ایڈیشن، ص ۳۰	نسخۂ عرشی، ص ۱۳۹
اس رقم کو دیا طرازِ دوام	صدی ایڈیشن، ص ۱۹۳	نسخۂ عرشی، ص ۱۳۸
پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال	صدی ایڈیشن ۱۹۵	نسخۂ عرشی، ص ۱۳۰
ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت	صدی ایڈیشن ۲۰۶	نسخۂ عرشی، ص ۱۲۷

۷۔ صدی ایڈیشن میں نسخۂ نظامی کی تقلید میں ایک مصرع میں " جب " اور دو مصرعوں میں " جپ " ہے۔ مطالبہ کیا ہے کہ کوئی ایک لانا چاہیے۔ (۱۲) یہ مطالبہ غالب سے کیا جاتا تو بہتر تھا۔ اگر اس کے دیوان کے مستند نسخے میں دو تلفظ موجود ہیں اور معنوی اعتبار سے دونوں صحیح ہیں تو مرتب کو کیا حق ہے کہ ان میں تصحیف کر کے یکساں کر دے۔

۸۔ صدی ایڈیشن اور نسخۂ نظامی میں ہے:

افسوس کہ دیداں کا کیا رزق فلک نے

(صدی ایڈیشن، ص ۴۲)

نسخۂ عرشی (ص ۱۴۳) میں " دنداں " ہے اور عرشی صاحب نے نظامی کے متن " دیداں " کو سہو کاتب قرار دیا ہے (ص ۴۴۴)۔ رشید حسن خاں بھی اسے بہ اصرار سہو کاتب کہتے ہیں (۱۳) حالانکہ یہ ہرگز سہو نہیں۔ " دیداں " جمع ہے " دودہ " کی بمعنی کیڑا۔ معنی کے لحاظ سے " دیداں " " دنداں " سے بہتر تھا۔ آزاد کتاب گھر کے ایڈیشن کے اختلاف نسخ سے معلوم ہوتا ہے کہ انتخاب غالب میں " دنداں " ہے۔ (۱۴) چونکہ یہ نظامی کے بعد کا متن پیش کرتا ہے، اس لیے اسے ترجیح دی جائے گی ورنہ جہاں تک معنی کا تعلق ہے " دیداں " ہی بہتر تھا۔ چونکہ اجنبی لفظ تھا، اس لیے غالب نے اسے بدل دیا ہو گا۔

مالک رام صاحب کا اصول ترتیب متن یہ ہے کہ ایک متن کے مختلف نسخوں میں ایک نسخے کو اساسی قرار دے کر اسے کتاب کے متن میں درج کیجیے، بقیہ نسخوں کے متن کو اختلاف نسخ میں الا کہ بداہتاً معلوم ہو جائے کہ اساسی نسخے کا متن ناقص ہے اور کسی دوسرے کا ٹھیک ہے۔ (۱۵)

میں اس اصول کا قائل نہیں، جیسا کہ میں نے اور مضمون میں لکھا ہے (۱۶)

دیوانِ غالب صدی ایڈیشن پر رشید حسن خاں نے جو اعتراض کیے ہیں، ان کی ذمے داری مالک رام صاحب کے اسی اصول کی ہے کہ انھوں نے نظامی ایڈیشن کو اساسی نسخہ مان لیا ہے اور چند مستثنیات کے سوا اس تحریر کو من و عن نقل کر دیا ہے۔

•۔ نسخۂ نظامی اور ۱۹۵۷ء کے ایڈیشن میں مصرع ہے:

ہے نوآموز فنا ہمت دشوار پسند

صدی ایڈیشن میں "فنا" کو "وفا" کر دیا ہے۔ اس کا ماخذ ہمیں معلوم نہیں۔

دلِ پروانہ چراغاں، پرِ بلبل گلنار
(صدی ایڈیشن، ص ۱۸۵)

نسخۂ نظامی اور دوسرے ایڈیشنوں میں "گلنار" کی جگہ "گل زار" ہے۔ رشید حسن خاں حیران ہیں کہ یہ "گلنار" کہاں سے لیا ہے۔ وہ آزاد کتاب گھر کا ایڈیشن (ص ۲۳۶) دیکھ لیتے تو معلوم ہو جاتا کہ یہ آصفیہ کی تصحیح شدہ کاپی کے مطابق ہے۔ اگر غالب نے "گل زار" کو بدل کر "گلنار" کر دیا تھا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ نظامی ایڈیشن میں "گل زار" کیونکر چھپا۔ ممکن ہے، "گل زار" کی اصلاح "گلنار" غالب کے بعد کسی اور شخص نے کی ہو اور مالک رام نے اسے اصلی سمجھ کر قبول کر لیا ہو۔

کھول کر پردہ، ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے
(صدی ایڈیشن، ص ۲۱۱)

اعتراض ہے کہ غالب کا املا "زرا" تھا اس لیے "ذرا" غلط ہے۔ اس دعوے کی تائید میں نسخۂ عرشی کے ص ۲۲۵ کے حاشیے کو پیش کیا ہے۔[۱۷] اتفاق سے نسخۂ عرشی ص ۲۲۵ پر "زرا" کا لفظ کہیں نہیں آیا اور اس لیے اس صفحے کے حواشی میں بھی اس کا مذکور نہیں۔ مندرجۂ بالا مصرع نسخۂ عرشی کے ص ۲۳۵ پر ہے، لیکن اس کے حواشی میں یہ نہیں لکھا کہ غالب نے اس لفظ کی "ذال" کو چھیل کر "زرا" بنا دیا تھا۔ خدا معلوم یہ قول نسخۂ عرشی کے کس صفحے پر ہے۔ وہاں صرف یہ لکھا ہے کہ دیوانِ غالب کے پہلے ایڈیشن کے علاوہ بقیہ سب میں "ذرا" ہے۔ جب مالک رام صاحب نے نظامی

ایڈیشن کو اساسی نسخہ قرار دیا ہے تو وہ اپنے اصول کے مطابق "ذرا" ہی لکھتے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں املائے غالب پر موجودہ املا کو ترجیح دیتا ہوں۔

زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما

(صدی ایڈیشن، ص ۳۰)

رشید حسن خاں حیران ہیں کہ "تھما" غالب کی کس تحریر کی بنا پر لکھا ہوگا۔ (۱۸) وہ اس کا ماخذ جاننے کے لیے آزاد کتاب گھر کا ایڈیشن اور نسخۂ عرشی (۱۹) دیکھ لیتے تو واضح ہو جاتا کہ متعدد قلمی اور مطبوعہ نسخوں مثلاً نسخۂ رام پور جدید، نظامی ایڈیشن وغیرہ میں "تھما" یا "تھمبا" ہی ہے، صرف "اردوئے معلی" میں "تھما" ہے۔ ہاں، دوسرے مصرع "رو میں ہے رخش عمر، کہاں دیکھیے تھمے" پر ان کی حیرانی بجا ہے کہ "تھمے" کہاں سے آگیا، کیونکہ نظامی ایڈیشن میں "تھمے" ہے اور نسخۂ عرشی (ص ۳۴۳) کی صراحت کے مطابق دوسرے قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں تھمے یا تھمبے ہے۔ شاید تھمبے تھمبے اور تھمے غالب کے املا میں ارتقا ظاہر کرتے ہیں۔ چونکہ ان کا تلفظ مختلف ہے، اس لیے مرتب ان میں ترمیم کا مجاز نہیں۔

سادگی و "پرکاری"، بےخودی و ہشیاری

(صدی ایڈیشن، ص ۳۰)

ایک عالم پہ ہیں طوفانی کیفیت فصل

(صدی ایڈیشن، ص ۳۵)

ہوئی یہ کثرت غم سے تلف کیفیت شادی

(صدی ایڈیشن، ص ۴۳)

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ

(صدی ایڈیشن، ص ۱۶۳)

مطالبہ (۲۰) ہے کہ سادگی، بے خودی، مدعی اور کیفیت کی "ی" پر تشدید کا نشان چاہیے۔ نسخۂ عرشی میں صورت یہ ہے کہ سادگی، بے خودی، مدعی اور کیفیت فصل کی "ی" پر تشدید نہیں لیکن "کیفیت شادی" میں 'کیفیت' پر تشدید ہے۔

رشید حسن خان کا خیال ہے کہ ان الفاظ میں تشدید کے بغیر تلفظ غلط ہو سکتا ہے۔ عربی فارسی سے قطع نظر میں اردو کے املا کی حد تک پُرزور اپیل کروں گا کہ ان الفاظ پر تشدید ہرگز نہ لگائیے کہ اس سے تلفظ مسخ ہو جائے گا۔ تشدید اور دوہرے حرف میں فرق ہے۔ "بنّا، چنّی" مختلف ہیں اور "بننا، چھننی" ان سے مختلف۔ میں صوتیات کی اصطلاح میں بات کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

تشدید کو ادا کرنے کے لیے زبان اس آواز کے مخرج پر معمول سے زیادہ عرصے تک ٹھہری رہتی ہے۔ دوہری آواز ادا کرنے کے لیے اعضائے نطق اس آواز کے مخرج پر ایک بار آتے ہیں، پھر معمول کی حالت پر لوٹ جاتے ہیں اور پھر دوبارہ اس آواز کے مخرج پر جا پہنچتے ہیں۔ مندرجہ بالا مصرعوں میں "ی" یا "و" کی دونوں آوازیں مختلف ہیں۔ پہلی بار یہ مصوتے (حرفِ علت) کی شکل میں بولی جاتی ہیں اور اس کے بعد مصمتے (حرفِ صحیح) کے روپ میں۔ اس طرح ہم "ی" یا "و" کو مشدد نہیں بولتے بلکہ دو بار بولتے ہیں۔ ہندی میں لکھ کر دیکھ لیجیے، بات واضح ہو جائے گی۔ صوتیات سے قطع نظر اردو میں مشدد "ی" پر تشدید کا نشان لگائیں تو اس کا تلفظ "کے نی یت" نہ رہ کر "کے فیت" (میت اور نیر کی طرح) ہو جائے گا۔ اسی طرح سادگی و پرکاری میں سادگی کی "ی" پر تشدید لگانے سے سادگیو (سعی و سفارش کی "ی و" کی طرح) پڑھا جائے گا۔ میر عباس شوستری کا مشہور شعر ہے:

ایں کلامِ صوفیانِ شوم نیست
مثنویِ مولویِ روم نیست

دوسرے مصرع میں "مثنوی" اور "مولوی" کی "ی" میں اضافت کے بعد وہی صورت بن جاتی ہے جو "سادگی و پرکاری" میں واوِ عطف سے پہلے کی "ی" ہے۔ اگر بصورت اضافت یائے معروف پر تشدید کا نشان نہیں لگایا جا سکتا تو بصورتِ عطف کیوں ضروری ہو، اس لیے عربی و فارسی روایات کو نظرانداز کرتے ہوئے میں التماس کروں گا کہ مندرجہ بالا مصرعوں میں تشدید لگا کر املا کو غلط تلفظ کا حامل نہ بنائیے۔

رشید حسن خان نے یہ تبصرہ غیر معمولی طور پر بالاستیعاب مطالعے کے بعد لکھا ہے۔ ان کے بیش تر مشاہدات سے اتفاق کیا جائے گا۔ دیوانِ غالب صدی ایڈیشن کے جن مندرجات پر انھیں اعتراض ہے، ان کی سب سے بڑی وجہ مالک رام کا یہ اصول ہے کہ اساسی نسخے کا متن جیوں کا تیوں لکھ دینا چاہیے اور دوسرے نسخوں کے متن کو اختلافِ نسخ میں دینا چاہیے۔ ڈاکٹر نذیر احمد[۱۳]، راقم الحروف،[۱۴] اور رشید حسن خان[۱۵] بہترین متن کے انتخاب کے حامل ہیں۔

دیوانِ غالب میں تسامحات کی دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مالک رام کا مطمحِ نظر غیر معمولی کاوش کے بعد ایسا محققانہ متن تیار کرنا نہ ہوگا جیسا نسخۂ عرشی کی تیاری میں روا رکھا گیا۔ میرا خیال ہے کہ صدی ایڈیشن عام قارئین کے لیے چھاپا گیا ہے، اسی لیے انھیں اختلافاتِ نسخ کی تفصیلات سے منغض نہیں کیا گیا۔

خطوطِ غالب

اس کتاب کی پہلی جلد ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے ٹائپ میں شائع ہوئی۔ اس کے سرورق کے اندر لکھا تھا:

خطوطِ غالب

مرزا اسد اللہ خاں غالب کے خط، رقعے وغیرہ

مہیش پرشاد

نے مختلف ماخذوں سے جمع کر کے ترتیب دیے

عبدالستار صدیقی

نے نظرِ ثانی کی

پہلی جلد

۱۹۴۱ء

اس کی ابتدا میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا ۱۵ مارچ ۱۹۴۱ء کا مقدمہ ہے اور ان کے بعد منشی مہیش پرشاد کا جنوری ۱۹۳۱ء کا دیباچہ۔ آگے خطوں کا متن ہے اور آخر میں دو صفحوں کا غلط نامہ۔ اپنے مقدمے میں ڈاکٹر صدیقی نے صراحت کر دی ہے کہ خطوں کی جانچ اور ترتیب مہیش پرشاد نے کی ہے۔ صدیقی صاحب نے صرف یہ کیا:

متن کی نظرِثانی کرتے وقت جہاں کہیں کوئی صریح غلطی سامنے آگئی ضروری ردّ و بدل کر دی۔ جہاں ضرورت دیکھی، اپنی طرف سے حاشیے لکھ دیا۔ ایسے حاشیے کے آخر میں "مصحح" کا لفظ لکھ دیا ہے یا اپنے نام کے سرحرف"۔ (۲۲)

ڈاکٹر صدیقی نے امید ظاہر کی تھی کہ دوسری جلد اسی سال ۱۹۴۱ء میں چھپ جائے گی لیکن وہ آج تک نہیں چھپی۔ منشی مہیش پرشاد کا انتقال اگست ۱۹۵۱ء میں ہوا تھا۔ منشی جی کے جملہ کاغذات ہندوستانی اکیڈمی نے خرید لیے جن میں ان کی مرتبہ دوسری جلد کا مسودہ بھی تھا۔ ہندوستانی اکیڈمی انجمن کے حق میں دست بردار ہو گئی۔ انجمن نے ان کی ترتیبِ نو کا کام مالک رام کے سپرد کیا، چنانچہ جلد اوّل ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی چونکہ سرور صاحب کے تعارف پر ۲۰ مارچ ۱۹۸۴ء درج ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ کتاب ۱۹۸۴ء میں نہیں، دراصل ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی۔ تعارف کے بعد مہیش پرشاد کے ۱۹۴۱ء کے ایڈیشن کا دیباچہ دے دیا گیا۔

رسالہ "تحریک" جنوری ۱۹۶۹ء اور دسمبر ۱۹۸۴ء تا مارچ ۱۹۸۵ء کے شماروں میں اس ایڈیشن پر مختلف اعتراضات شائع ہوئے ہیں جن میں بنیادی اعتراض یہ تھا کہ مالک رام صاحب نے مرتب کی حیثیت سے مہیش پرشاد کا نام کیوں ہٹا دیا ہے۔ ناواقفیت کی وجہ سے میں نے بھی ایک یا دو خطوط لکھ دیے تھے۔ مجھے اس وقت پورے حقائق معلوم نہ تھے۔ "ہماری زبان" میں مالک رام صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں انھوں نے شکوہ کیا:

"میرا خیال تھا کہ اگر کوئی صاحب تھوڑی سی تحقیق یا تجسس سے کام لیں گے تو وہ آسانی سے یہ اختلاف معلوم کر لیں گے۔ لیکن افسوس کہ ایسا

نہیں ہوا۔ ہم میں سے بیش تر لوگ خود غور و فکر نہیں کرتے، دوسروں کے کہنے پر آمنا و صدقنا کہنے ہی میں عافیت دیکھتے ہیں"۔

بالکل صحیح کہا ہے۔ زیرِ نظر مضمون لکھتے وقت میں نے سوچا کہ کہیں سے مہیش پرشاد کی کتاب حاصل کر کے دونوں کا تقابلی مطالعہ کروں اور بطور خود معلوم کروں کہ مالک رام صاحب نے کچھ اضافہ کیا ہے کہ نہیں۔ چونکہ خطوطِ غالب کے سلسلے میں مجھے مالک رام صاحب نے کبھی کچھ نہیں لکھا، نہ ان سے اس موضوع پر بات ہوئی، اس لیے اس تحریر کے وقت بھی میں نے سوچا کہ انھیں طوث کیے بغیر از خود حقیقت کی دریافت کروں گا۔ اس کے لیے مہیش پرشاد کی مرتبہ "خطوطِ غالب" کی ضرورت تھی۔ الہ آباد یونیورسٹی لائبریری میں اس کی کاپی نہ ملی۔ یہ کتاب ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے شائع ہوئی تھی۔ اُس وقت میں اس کے دو نائب صدور میں سے ایک تھا۔ میں نے اکیڈمی سے اس کی ایک کاپی لینے کو آدمی بھیجا۔ اہلِ دفتر اور سکریٹری نے رجسٹر وغیرہ دیکھ کر قطعیت سے کہا کہ ہندوستانی اکیڈمی سے ایسی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی، لیکن اکیڈمی نے اپنی شائع شدہ ہندی کتاب "غالب کے پتر" دو جلدیں بھیج دیں۔

ہندی کتاب کی جلد اول (۱۹۵۸ء) کے مرتب تنہا ڈاکٹر شری رام شرما ہیں۔ پہلی جلد کے دیباچے میں لکھا ہے کہ اس میں اکیڈمی کی شائع شدہ اردو کتاب "خطوطِ غالب" مرتبہ مہیش پرشاد کا متن پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ دیکھ کر میں نے پھر سکریٹری سے فریاد کی۔ پھر تلاش کی گئی اور کسی گوشے سے مہیش پرشاد کی ایک جلد برآمد کر کے مجھے بھیجی گئی۔ ہندی کتاب کی دوسری جلد میں مرتب کے التماس (دیباچہ) کا پہلا جملہ ہے،

"مرزا اسد اللہ خاں غالب ۱۸۴۸ء کے آس پاس ہندی میں پتر لکھنے لگے"۔

اس "ہندی" کے دعوے پر قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔ معلوم ہوا، "اردوے معلیٰ" اور "عودِ ہندی" ہندی کتابوں کے نام ہیں۔ مرتب وہی حیدر آباد کے ڈاکٹر شری رام شرما ہیں جو دکنی اردو کو دکنی ہندی کہنے میں پیش پیش ہیں۔ جلدِ دوم میں انھوں نے غلام رسول مہر کی دونوں جلدوں، نیز "نادراتِ غالب" مرتبہ آفاق حسین کراچی سے فائدہ اٹھایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُس وقت تک اردو کے کسی ایڈیشن میں

غالب کے اتنے خطوط نہیں جتنے ہندی کی ان جلدوں میں ہیں۔ مہیش پرشاد جملہ خطوط کا احاطہ کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنی جلدِ اوّل میں مکاتیبِ غالب (عرشی) سے نواب یوسف علی خاں اور صاحب زادہ زین العابدین خاں کلن کے خطوط تو لے لیے لیکن نواب کلبِ علی خاں اور دوسروں کے خطوط جلدِ دوم میں شامل کرنے کا ارادہ کیا ہو گا اور وہ منظرِ عام پر آئی ہی نہیں۔ مالک رام صاحب نے مہیش پرشاد کی جلدِ اوّل کو "محاوراتِ غالب" کے خطوط، بنام منشی نبی بخش حقیر، کے اضافے کے ساتھ چھاپا۔ غلام رسول مہر[۲۶] نے اپنی کتاب میں "مکاتیبِ غالب" مرتبۂ عرشی، نیز "محاوراتِ غالب" مرتبۂ آفاق کے خطوط کو چھوڑ کر جملہ سب خطوط لے لیے۔ اس طرح شری رام شرما کی کتاب میں نواب یوسف علی خاں، نیز حقیر کے نام کے خطوط بھی شامل ہیں۔ اس وقت تک کے اردو کے کسی مجموعے میں اتنے خطوط نہیں۔

میں نے "خطوطِ غالب" نسخۂ مہیش پرشاد اور "خطوطِ غالب" نسخۂ مالک رام کا بالاستیعاب تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ میں نے خطوں کی تاریخوں اور حاشیوں (فٹ نوٹ) کو خاص طور سے ملایا ہے۔ واضح ہو کہ فٹ نوٹ کے حواشی زیادہ تر اختلافِ نسخ پیش کرتے ہیں۔ میں اپنے تقابل کو مختلف عنوانات کے تحت درج کرتا ہوں:

۱۔ مکتوب الیہ کا انتساب

مالک رام صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے:

> "مطبوعہ نسخے میں بعض خطوط غلط نام سے چھپ گئے تھے۔ انھیں اصلی مکتوب کے نام کے خطوں میں ڈال دیا"۔
>
> ("ہماری زبان"، ۸ مارچ ۱۹۷۵ء، ص ۲)

مجھے اس قسم کی صرف ایک مثال ملی۔ نسخۂ مہیش میں ص ۷۵ پر خط نمبر ۵۸ ہرگوپال تفتہ کے نام دکھایا ہے۔ غلام رسول مہر نے طے کیا کہ یہ دراصل مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام ہے۔[۲۷] مالک رام صاحب کا بھی یہی فیصلہ ہے، چنانچہ ان کے ایڈیشن میں یہ مہر کے نام خط نمبر ... ص ۳۵۵ پر ہے۔ نسخۂ مالک رام میں مہر

کے نام کے خط نمبر ۲، ۳۰ اور شیو نرائن آرام کے نام کے خط نمبر ۱۰، ۱۱ کو پڑھیے تو یقین ہو جاتا ہے کہ زیر بحث خط کا تعلق مہر ہی سے ہے۔

۲۔ خطوط میں اضافے

نسخۂ مالک میں خطوں کی جملہ تعداد ۵۲۸ ہے۔ مالک رام صاحب نے لکھا ہے کہ مہیش پرشاد کے ایڈیشن میں جملہ خطوط ۳۵۲ ہیں (۲۸) چنانچہ اس کتاب میں آخری خط پر نمبر شمار ۳۵۲ پڑا ہے۔ لیکن چونکہ مجروح کے نام کے خط نمبر ۴۹ پر مجموعی شمار کا نمبر ۳۳۱ اور نمبر ۵۰ پر ۳۳۱ ب پڑا ہے، اس لیے نسخۂ مہیش میں خطوں کی جملہ تعداد دراصل ۳۵۳ ہے۔

مہیش پرشاد اور مالک رام کی درمیانی منزل غلام رسول مہر کا نسخہ ہے۔ گو نسخۂ مالک رام نسخۂ مہیش پرشاد ہی کی اصلاح شدہ شکل ہے، لیکن اول الذکر میں نسخۂ غلام رسول مہر سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ نسخۂ مہر میں "مکاتیبِ غالب" مرتبۂ عرشی اور "نادراتِ غالب" مرتبۂ آفاق حسین کو چھوڑ کر بقیہ سب خطوط، جن تک مہر کی رسائی تھی، لے لیے گئے ہیں۔ ذیل میں اول تینوں نسخوں میں خطوط کی تعداد کا ایک چارٹ دیا جاتا ہے۔ نسخۂ مہر سے صرف وہ مکتوب الیہ لیے گئے ہیں جو بقیہ دونوں نسخوں میں ہیں۔

مکتوب الیہ	نسخۂ مہیش پرشاد	نسخۂ غلام رسول مہر	نسخۂ مالک رام
۱۔ ہرگوپال تفتہ	۴۴	۴۴	۴۴
۲۔ نبی بخش حقیر	-	۲	۲۰
۳۔ جواہر سنگھ جوہر	۳	۳	۳
۴۔ عبداللطیف	-	۱	۲
۵۔ بدرالدین فقیر	۵	۵	۵
۶۔ عبدالجمیل جنوں	۳۰	۳۰	۳۰
۷۔ انوار الدولہ شفق	۲۱	۲۱	۲۱

۸ ۔ یوسف مرزا	۴	۴	۴
۹ ۔ یوسف علی خاں عزیز	۳	۳	۳
۱۰ ۔ احمد حسین میکش	۲	۲	۲
۱۱ ۔ محمد یوسف علی خاں ناظم	۲۷	-	۳۰
۱۲ ۔ غلام حسنین قدر بلگرامی	۲۲	۲۲	۲۲
۱۳ ۔ غلام نجف خاں	۲۳	۲۳	۲۳
۱۴ ۔ مہدی حسین مجروح	۵۰	۵۰	۵۰
۱۵ ۔ شہاب الدین ثاقب	۹	۹	۱۰
۱۶ ۔ حاتم علی بیگ مہر	۱۸	۲۰	۱۹
۱۷ ۔ زین العابدین خاں کلن	۲	-	۲
۱۸ ۔ علاء الدین احمد خاں علائی	۵۶	۵۶	۵۸
۱۹ ۔ ؟	۱	۱	۱
۲۰ ۔ شیونرائن آرام	۳۳	۳۴	۳۵
۲۱ ۔ ؟	۱	۱	۱
میزان	۴۵۳	۴۱۷	۵۲۸

میزان میں دی ہوئی یہ تعداد قدرے گم راہ کن ہے ۔ پہلے میرے ذیل کے مشاہدات ملاحظہ ہوں :

نسخۂ مالک میں تفتہ کے نام جو خط نمبر ۴۶ ص ۲۳ پر ہے ، مہیش پرشاد اور غلام رسول مہر نے اس کے دوسرے پیراگراف کو ایک خط کے طور پر درج کیا ہے ، یعنی نسخۂ مالک کا نمبر ۴۶ نسخۂ مہیش کا نمبر ۶۸ ، ۶۹ اور نسخۂ مہر میں نمبر ۴۶ ، ۶۷ ہے ۔ نسخۂ مہیش کے حاشیے سے معلوم ہوتا ہے کہ " اردوئے معلیٰ " کی پہلی اور دوسری اشاعتوں میں ان دونوں اجزا کو ایک رقعہ مانا گیا ہے اور بعد کی اشاعتوں میں دو رقعے مالک رام صاحب نے اپنے ایڈیشن کے حاشیے میں واضح کیا کہ بعد کی اشاعتوں کی بنا پر

انھیں دو رقعے ماننا صحیح نہیں۔ اس طرح دراصل نسخۂ مبیش میں تفتہ کے نام ۴۳ اور نسخۂ مہر میں ۴۱ خطوط ہیں۔

تفتہ کے نام کے خطوط کو لے کر نسخۂ مبیش اور نسخۂ مہر کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نسخۂ مہر میں تفتہ کے نام وہ مشہور خط نہیں جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے:

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

یہ شعر نسخۂ مبیش میں نمبر ۳۰، ص ۲۷ پر ہے اور نسخۂ مالک میں نمبر ۳۰ ص ۳۲ پر اس خط کے علاوہ مہر اور مالک رام نے تفتہ کے نام ایک خط کو حاتم علی بیگ مہر سے منسوب کیا۔ یہ خط نسخۂ مبیش میں تفتہ کے نام نمبر ۸۵، ص ۵۷ پر ہے جبکہ غلام رسول مہر کے یہاں مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام نمبر ۱۳، ص ۲۲۱ پر اور نسخۂ مالک میں مہر کے نام نمبر ۱۰، ص ۳۵۵ پر ہے۔ اس طرح نسخۂ مبیش سے نسخۂ مہر میں تفتہ کے نام دو خطوں کی کمی کی تاویل ہو گئی۔ نسخۂ مہر اور نسخۂ مالک دونوں میں تفتہ کے نام بظاہر ۴۲ خطوط ہیں، لیکن چونکہ نسخۂ مہر میں نسخۂ مالک کے ایک خط سے نمبر ۴۹ اور نمبر ۶۷ دو خطوط بنا لیے ہیں، اس لیے نسخۂ مہر میں نسخۂ مالک سے ایک خط کم ہوا اور یہ خط وہی ہے جو "رکھیو غالب — الخ" سے شروع ہوتا ہے۔

نسخۂ مبیش میں تفتہ کے نام ۴۴ خط ہیں۔ ہم نے طے کیا ہے کہ اس کے دو خطوں کے نسخۂ مالک میں ایک ہونے کی وجہ سے نسخۂ مبیش میں تفتہ کے نام دراصل ۴۳ خط ہیں۔ ان میں سے ایک خط وہ ہے جسے غلام رسول مہر اور مالک رام نے تفتہ سے حاتم علی بیگ مہر کو منتقل کر دیا۔

مالک رام نے "نادرات غالب" سے حقیر کے نام کے جملہ ۷۰ خطوط لے لیے۔ ان میں کا آخری یعنی نمبر ۷۰، نسخۂ مہر کا پہلا خط ہے، لیکن نسخۂ مہر کا خط نمبر ۲ بنام حقیر مؤرخہ ۷ جنوری ۱۸۵۹ء ص ۲۴۳ نسخۂ مالک سے غیر حاضر ہے۔

نسخۂ مبیش میں عبداللطیف کے نام کا کوئی خط نہیں۔ نسخۂ مہر میں ایک خط کا

اضافہ ہوا جو نسخۂ مالک میں ص ۳۰ پر عبداللطیف کے نام دوسرا خط (مجموعی شمار نمبر ۱۹۷) ہے۔ نسخۂ مالک میں عبداللطیف کے نام کا پہلا خط (مجموعی شمار نمبر ۱۹۲) مالک رام کا اضافہ ہے۔

نواب یوسف علی خاں ناظم کے ۳۷ اور صاحب زادہ زین العابدین خاں عرف کلن میاں کے نام کے دو خطوط نسخۂ مبیش میں "مکاتیب غالب" عرشی سے اور نسخۂ مالک میں نسخۂ مبیش سے لیے گئے۔ غلام رسول مہر نے یہ خط نہیں لیے۔ نسخۂ مالک کا مجموعی شمار کا خط نمبر ۲۰۸ یعنی شہاب الدین ثاقب کے نام کا خط نمبر ۹ ص ۲۳۱ نہ نسخۂ مبیش میں ہے، نہ نسخۂ غلام رسول مہر میں۔

نسخۂ مبیش میں حاتم علی بیگ مہر کے نام ۱۸ خط اور نسخۂ مالک میں ۱۹ خطوط ہیں نسخۂ مالک اور نسخۂ غلام رسول مہر میں ایک مزید خط وہ ہے جو تفتہ کے نام سے منتقل کیا گیا یہ خط نسخۂ مبیش میں تفتہ کے نام نمبر ۵۸ ہے، نسخۂ غلام رسول مہر میں مہر کے نام نمبر ۱۲ اور نسخۂ مالک میں حاتم علی بیگ مہر کے نام نمبر ۱۱ ہے۔ نسخۂ غلام رسول مہر میں مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام ایک مزید خط ہے جو اُن کے نسخے میں ص ۲۱۷ پر نمبر ۹، مؤرخہ ۳۰ ستمبر ۱۸۵۸ء ہے اور جو اس جملے سے شروع ہوتا ہے:

"شفیق با تحقیق مولانا مہر ذرۂ بے مقدار کا سلام قبول کریں"۔

معلوم نہیں، کیونکر یہ نسخۂ مالک میں شامل نہیں ہوا۔

نسخۂ مالک میں علاء الدین علائی کے نام دو خط نمبر ۱۲ اور نمبر ۵۳ نیز شیونرائن آرام کے نام خط نمبر ۱۸ ایسے ہیں جو نہ نسخۂ غلام رسول مہر میں ہیں، نہ نسخۂ مبیش میں۔ نسخۂ غلام رسول مہر میں ص ۲۳۵ پر آرام کے نام خط نمبر ۱۴ کے بعد نمبر ۱۶ ہے، نمبر ۱۵ سہواً غائب ہو گیا ہے۔ اس طرح گو نسخۂ مہر کے آخری خط پر نمبر ۲۵ پڑا ہے لیکن اس میں دراصل آرام کے نام ۲۴ خط ہیں۔

نسخۂ مبیش و نسخۂ مالک میں دو مجہول الاسم مکتوب الیہوں کے نام دو خط ہیں جو نسخۂ مالک میں مجموعی نمبر ۳۹۲ اور ۵۲۸ ہیں۔ ان دونوں پر تاریخیں پڑی ہیں۔ نسخۂ مہر میں اس طرح کے دو اور خطوط ہیں جن کا مکتوب الیہ معلوم نہیں۔ ان پر کوئی تاریخ

نہیں پڑی۔ شاید مالک رام نے انھیں اپنی جلد دوم میں شامل کرنے کا ارادہ کیا ہو۔ چونکہ نسخۂ مہیش پرشاد میں تفتہ کے نام کے دو خطوط دراصل ایک خط کے حصے ہیں، اسی لیے ہم نے طے کیا کہ اس میں جملہ ۴۵۳ نہیں، ۴۵۲ خطوط ہیں۔ یہ نسخۂ مالک کے ۵۲۸ خطوں سے بقدر ۷۶ کم ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

نسخۂ مالک کا صفحہ	مکتوب الیہ	مکتوب الیہ کے خطوں کا نمبر شمار	مجموعی نمبر شمار	تعداد
۱۰۱ تا ۱۴۷	نبی بخش حقیر	۱ تا ۷۰	۱۲۳ تا ۱۹۲	۷۰
۱۵۳ تا ۱۵۴	عبداللطیف	۱ تا ۲	۱۹۶ تا ۱۹۷	۲
۳۳۱	شہاب الدین احمد خاں ثاقب	۲	۳۰۸	۱
۳۷۹	علاء الدین احمد خاں علائی	۴	۴۳۵	۱
۴۱۳	علاء الدین احمد خاں علائی	۵۴	۴۸۶	۱
۴۳۵	شیونرائن آرام	۱۸	۵۱۰	۱
				کل ۷۶

نسخۂ مالک کے ذیل کے خطوط نسخۂ مہر میں نہیں:

نسخۂ مالک کا صفحہ	مکتوب الیہ	مکتوب الیہ کا نمبر شمار	مجموعی نمبر شمار	تعداد
۴۴	ہرگوپال تفتہ	۳۰	۳۰	۱
۱۰۱ تا ۱۴۹	نبی بخش حقیر	۱ تا ۶۹	۱۲۳ تا ۱۹۱	۶۹
۱۵۴	عبداللطیف	۱	۱۹۶	۱
۲۳۷ تا ۲۵۴	یوسف علی خاں ناظم	۱ تا ۳۷	۲۷۱ تا ۳۰۷	۳۷
۳۳۱	شہاب الدین احمد خاں ثاقب	۲	۳۰۸	۱
۳۴۵ تا ۳۴۶	زین العابدین احمد خاں گلن	۱ تا ۲	۴۳۲ تا ۴۳۳	۲
۳۷۹، ۴۱۳	علاء الدین احمد خاں علائی	۴، ۵۴	۴۳۵، ۴۸۶	۲
۴۳۵	شیونرائن آرام	۱۸	۵۱۰	۱
				کل ۱۱۴

مندرجہ بالا مکتوب الیہم کے نام کے خطوط میں سے ذیل کے دو خط نسخۂ غلام رسول مہر میں ہیں لیکن نسخۂ مالک میں نہیں:

نسخۂ مہر کا صفحہ	مکتوب الیہ	مکتوب الیہ کا نمبر شمار	تعداد
۲۴	نبی بخش حقیر	۲	۱
۲۱۷	مرزا حاتم علی بیگ مہر	۹	۱
		کل	۲

نسخۂ مالک میں یہ دو خط شاید سہواً شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔ چونکہ مہیش پرشاد کے ایڈیشن کی اشاعت تک نبی بخش حقیر کے خطوط کا مجموعہ "نادراتِ غالب" شائع نہیں ہوا تھا، اس لیے انھیں چھوڑ کر مالک رام نے مزید چھ خطوط ہی اضافہ کیے۔ اسی طرح غلام رسول مہر نے چونکہ قصداً "مکاتیب غالب" (عرشی) اور "نادراتِ غالب" کے خطوط شامل نہیں کیے، اس لیے انھیں چھوڑ کر مالک رام نے مزید آٹھ خطوط ہی دیے۔

خطوں کی تاریخیں

غالب نے اپنے بہت سے خطوں میں تاریخیں نہیں دی تھیں۔ بعض میں تاریخ ناکافی تھی، مثلاً دن یا مہینا تھا لیکن سال ندارد۔ منشی مہیش پرشاد نے حتی الامکان تاریخیں معلوم کیں اور اپنی دریافت کو خط کے آخر میں قوسین میں دیا۔ چونکہ اس جلد میں مفصل حواشی نہیں، اس لیے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ مہیش پرشاد نے جو تاریخیں طے کیں، ان کی کیا بنیاد تھی۔ ان کے بعد غلام رسول مہر نے بھی اپنے نسخے میں خطوں کی تاریخیں طے کی ہیں، لیکن انھوں نے حاشیے میں اپنے فیصلے کی وجہ لکھ دی ہے۔ امید ہے کہ مالک رام صاحب نے اپنے نسخے کی ترتیب کے وقت نسخۂ مہیش کی تاریخوں کا لازماً اور نسخۂ مہر کی تاریخوں کا غالباً جائزہ لیا ہوگا۔ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"جن خطوں کے بارے میں تاریخ کی تصحیح ہو سکی، ان کا مقام بدل دیا"۔ (۲۹)

یہ دعویٰ درست ہے۔ انھوں نے چند خطوں کی تاریخوں میں ترمیم کی۔ چند خطوں میں نسخۂ مہیش میں تاریخ نہ تھی، انھوں نے دریافت کر کے درج کی۔ میں نے نسخۂ مہیش اور نسخۂ مالک کی تاریخوں کا بالاستیعاب تقابلی مطالعہ کیا ہے، لیکن مجھے

غلام رسول مہر کا نسخہ بعد میں ملا۔ اس میں بیش تر میں٭ نے انھیں خطوط کی تاریخ دیکھی ہے جن کے بارے میں مہیش و نسخہ مالک میں اتفاق نہیں۔ ذیل میں تینوں نسخوں کے اختلافات درج کرتا ہوں۔ خطوں کا نمبر ہر مکتوب الیہ کے شمار کے مطابق ہے۔ ترتیب نسخہ مالک رام کے اعتبار سے کی گئی ہے۔

(جدول صفحہ ۱۵۳ پر ملاحظہ کی جائے)

اوپر کی جدول میں تفتہ کے نام کے چوتھے خط کی کیفیت یہ ہے کہ تینوں حضرات نے متن میں ۳۱/اکتوبر ۱۸۸۰ء تاریخ درج کی ہے۔ مہیش پرشاد اور مالک رام دونوں نے یہ حاشیہ بھی لکھا ہے کہ "اردوے معلیٰ" کی پہلی او دوسری اشاعت میں ۱۸۸۳ء درج ہے۔ اس پر مالک رام نے مزید حاشیہ دیا ہے کہ یہی صحیح ہے۔ ظاہر ہے کہ قدیم تر اشاعت زیادہ معتبر ہوتی ہے لیکن مالک رام کو چاہیے تھا کہ وہ متن میں ۱۸۸۳ء درج کرتے اور فٹ نوٹ میں ۱۸۸۳ء۔

دو ایسے خطوط ہیں جن پر نسخہ مہیش میں تاریخ درج ہے لیکن نسخہ الک رام میں نہیں۔ مجروح کے نام کے خط نمبر ۱۹ پر اصلاً تاریخ نہ تھی، مہیش پرشاد نے ۱۸۵۸ء طے کی، غلام رسول مہر نے اپنے مجموعے میں اسی کو درج کر دیا۔ مالک رام نے اس خط پر کوئی تاریخ نہیں دی جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مطمئن نہیں کہ یہ خط بالیقین ۱۸۵۹ء ہی کا ہے۔ صاحب زادہ زین العابدین خاں عرف کلن میاں کے نام کے خط نمبر ۲ پر مہیش پرشاد نے تاریخ دی ہے اور مالک رام نے نہیں۔ یہ مالک رام صاحب کی صریح فروگزاشت ہے، کیونکہ یہ خط "مکاتیب غالب" مرتبہ مولانا عرشی سے لیا گیا ہے اور وہاں اس پر صاف صاف ۱۳ مارچ ۱۸۶۵ء درج ہے۔ (۳۰)

اس طرح نسخہ مالک رام میں نسخہ مہیش کے ۳ خطوں کی (زین العابدین خاں کے خط کو چھوڑ کر) تاریخ میں ترمیم کی گئی ہے۔ غلام رسول مہر کی درج کردہ بعض تاریخوں میں بھی تبدیلی ہے، ان میں سے چار مثالیں ایسی ہیں جہاں مہر تاریخ طے نہ کر سکے لیکن مالک رام نے کر دی۔

خط چونکہ تاریخ وار ترتیب دیے گئے ہیں، اس لیے تاریخ بدلنے کے ساتھ نسخہ مالک

میں ترتیب بھی بدل گئی ہے۔ تاریخ کے علاوہ بھی نسخۂ مالک میں بعض خطوں کی ترتیب نسخۂ مہیش سے بدلی ہوئی ہے۔ مثلاً نسخۂ مالک کے مندرجہ ذیل خطوط کی،

نمبر ۱۳،۱۲، ۵۹ اور اس کے آس پاس کے خطوط ۸۸، ۹۰، ۱۰۰، ۱۰۱، ۲۲۵، ۲۳۸ تا ۲۳۸۔

ان میں یا تو تاریخ نہیں دی یا مہینا اور سال ہے لیکن صحیح تاریخ نہیں۔ پھر بھی نسخۂ مہیش کے مقابلے میں ان کی ترتیب مختلف ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ گو مالک رام قطعی تاریخ طے نہ کر سکے لیکن خطوں کے مضمون کی بنا پر تقدیم و تاخیر کی مختلف تعیین کر سکے۔ لیکن نسخۂ مالک میں ص ۳۷۳ سے ۳۷۷ تک علائی کے نام کے نمبر ۹، ۱۰ کی ترتیب نسخۂ مہیش کے برعکس ہے جس کا جواز سمجھ میں نہیں آتا۔ نمبر ۹ کی تاریخ جون ۱۸۶۱ء ہے اور نمبر ۱۰ کی یکم جون ۱۸۶۱ء۔ ظاہر ہے کہ نمبر ۹ جون کے مہینے میں یکم کے بعد کی کسی تاریخ کے بعد ہو گا، اس لیے ظاہراً اسے نمبر ۱۰ سے موخر رکھنا چاہیے۔

" خطوطِ غالب" کے ایک حالیہ محقق، کاظم علی خاں ہیں۔ ان کی کتاب " خطوطِ غالب کا تحقیقی مطالعہ" ۱۹۸۱ء میں کتاب نگر لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ انھوں نے مختلف مجموعوں میں " خطوطِ غالب" کی تاریخوں سے بحث کی ہے۔ انھیں میں تین صفحوں کا ایک مضمون ' خطوطِ غالب مرتبہ مالک رام میں خطوط کی تاریخیں ' ہے۔ یہ اصلاً " سرفراز" لکھنؤ، مؤرخہ ۲ اپریل ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ مضمون میں لکھا ہے کہ مالک رام صاحب کے ایڈیشن میں تاریخوں کے اندراجات کی متعدد فروگزاشتیں ملتی ہیں جن میں سے ۱۱ نمائندہ مثالیں انھوں نے درج کی ہیں (ص ۴۷)۔

ان مثالوں میں بیشتر یوم و تاریخ عیسوی میں، ازراہِ تقویم، ایک دن کے فرق کی نشان دہی کی ہے۔ جیسا کہ پیچھے غالب کی تاریخِ ولادت والے مضمون میں لکھا گیا، نہ صرف ایک بلکہ بعض اوقات تین دنوں تک کا فرق ہو سکتا ہے۔ کاظم علی خاں نے انجمنِ ترقیِ اردو کی ابو نصر محمد خالدی کی تقویم استعمال کی ہوگی جبکہ مالک رام دیوان بہادر ایل ڈی سوامی کنو پلے کی Indian Ephemeris (مدراس، ۱۹۱۵ء) کو سب سے زیادہ قابلِ اعتبار مانتے ہیں (" تلامذۂ غالب "، طبع دوم، ص ۵۷۶)۔ ایک دن کے فرق سے قطعِ نظر کاظم علی خاں کی نشان دادہ بعض تصحیحات کو اپنے مشاہدات کے ساتھ پیش کرتا

حواشی:

۱۔ "خطوطِ غالب" ص ۸۶-۸۷ پر مکتوب نمبر ۱۷ بنام تفتہ ہے۔ اس کے آخر میں تاریخ ۲ شنبہ ۲۳ اگست درج ہے، سنہ نہیں۔ مہیش پرشاد اور غلام رسول مہر نے اس کا سنہ ۱۸۵۸ء لکھا، مالک رام نے ۱۸۵۹ء۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے بھی غالب کے خطوط (جلد اوّل، ص ۲۸۳) میں ۱۸۵۸ء لکھا ہے۔ کاظم علی خاں دن کی رعایت سے ۱۸۵۸ء کو صحیح اور ۱۸۵۹ء کو غلط ٹھہراتے ہیں (تحقیقی مطالعہ، ص ۲۷)۔ ان حضرات نے اس جملے پر دھیان نہیں دیا:

"اگر دستنبو کو سراسر غور سے دیکھو گے تو اپنا نام پاؤ گے"۔

دستنبو نومبر ۱۸۵۸ء سے شروع میں چھپی۔ غالب نے ۴ نومبر ۱۸۵۸ء کو پہلی بار مطبوعہ جلد دیکھی (معین الرحمان، علمی سرمایہ، ص ۲۸۳)۔ اس سے ظاہر ہے کہ تفتہ کے نام یہ خط اگست ۱۸۵۸ء میں نہیں، اگست ۱۸۵۹ء ہی میں لکھا گیا ہو گا۔

۲۔ "خطوطِ غالب" میں ص ۱۶۳ پر منشی عبداللطیف کے نام کے خط پر تاریخ ۱۲ دسمبر ۱۸۵۸ء درج ہے جبکہ متنِ خط میں صاف لکھا ہے "آج ۶ دسمبر ہے"۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے بھی دسمبر درج کی ہے (جلد سوم، ص ۱۰۴۷)۔ صاف ظاہر ہے کہ مالک رام کے ایڈیشن میں ۱۲ دسمبر سہوِ کتابت ہے۔

۳۔ خط نمبر ۳۴۳ بنام مجروح (ص ۳۰۰) پر فروری ۱۸۵۶ء درج ہے۔ خط کے مندرجات اسے ۱۸۵۹ء کا مکتوب بتاتے ہیں۔ کاظم علی خاں کا اعتراض درست ہے۔ خط میں صاف لکھا ہے:

"یہ فروری سنہ ۱۸۵۹ء، بائیسواں مہینا ہے" (ص ۲۹۹)۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس خط کے بھی آخر میں ۱۸۵۶ء سہوِ کتابت ہے۔

۴۔ خط نمبر ۵۱۵ بنام شیو نرائن آرام (ص ۴۳۹) کے آخر میں ۱۳ جولائی ۱۸۵۹ء درج ہے، جبکہ "اردوے معلیٰ" میں اس کی تاریخ ۲۳ جولائی ۱۸۵۹ء ہے جو صحیح ہے (تحقیقی مطالعہ، ص ۲۹)۔ کاظم علی خاں کا فرمانا بجا ہے۔ خلیق انجم نے بھی اس کی تاریخ ۲۳ جولائی ۱۸۵۹ء لکھی ہے (جلد سوم، ص ۱۰۶۷)۔ ۲۳ جولائی کو ۱۳ جولائی کا ... ، معلوم نہیں مرتب کا سہو ہے کہ کاتب کا

حواشی

مہیش پرشاد اور مالک رام دونوں کے نسخوں میں فٹ نوٹ میں کچھ حواشی دیے ہیں جو بہت مختصر ہیں۔ بیش تر ان کا تعلق اختلافِ نسخ سے ہے۔ نسخۂ مہیش میں ان حاشیوں کے مصنف تین اشخاص ہیں:

۱۔ غالب۔ "اردوے معلیٰ" اور "عودِ ہندی" میں کچھ حاشیے ملتے ہیں جن کے بارے میں یقین کیا جا سکا کہ وہ غالب کے لکھے ہوئے ہیں۔ انھیں نسخۂ مہیش میں برقرار رکھا گیا ہے اور ان کے آگے "غ" لکھ دیا ہے۔ مثلاً نسخۂ مہیش میں ص ۳۳۰ اور نسخۂ مالک میں ص ۳۰۸ کا حاشیہ۔

۲۔ بعض حواشی مہیش پرشاد کے لکھے ہوئے ہیں۔

۳۔ زیادہ تر حواشی عبدالستار صدیقی کے ہیں اور ان کے آخر میں "ع۔ ص" یا "مصحح" لکھا ہوا ہے۔

نسخۂ مالک میں نسخۂ مہیش کے کم از کم سات حاشیوں کو چھوڑ کر بقیہ کو لے لیا گیا ہے سات محذوف حواشی یہ ہیں:

نسخۂ مہیش کا صفحہ	نسخۂ مالک کا متوازی صفحہ
۳۷	۳۹
۴۵ کا حاشیہ نمبر ۳۰۳	۱۹۹
۱۸۸	۲۴۳
۲۲۵	۲۸۳
۳۶۷	۴۱۳
۳۹۹	۴۴۰

ان حاشیوں کو نہ لینے کی کچھ وجوہ ہیں، یعنی یا تو انھیں نسخۂ مالک کے متن میں شامل کر لیا ہے یا مالک رام ان سے متفق نہیں۔

نسخۂ مہیش میں عبدالستار صدیقی نے اپنے مقدمے میں "استدراک" کے عنوان سے

بجز طباعت ۳۹ اصلاحیں یا حواشی درج کیے ہیں۔ ان میں سے بیش تر کو مالک رام نے متن میں سمو لیا یا حاشیے کی شکل میں درج کر دیا۔ لیکن شاملِ استدراک ذیل کے حواشی کو نظرانداز کر دیا۔ نسخۂ مالک کے صفحے کے حوالے سے ص ۹۳-۹۴ (خط نمبر ۱۱۱ ملک ۷۹ اے ۲۲ "استدراک" میں نسخۂ مبیش کے ص ۱۸۷ سے متعلق نوٹ زیادہ مفصل ہے، جبکہ نسخۂ مالک میں ص ۲۴۳ پہ یہ قدرے مختصر ہے مگر اس کا ماحصل لے لیا ہے۔ نسخۂ مالک میں ص ۲۸۱ سے متعلق حاشیہ بھی نسخۂ مبیش سے مختصر تر ہے۔ اس طرح نسخۂ مبیش کے حواشی (مع حواشی استدراک) میں سے مالک رام نے ۶ ۴ یعنی ۱۰ کو نہیں لیا۔ انھوں نے غالباً ان کو قبول نہیں کیا۔ نسخۂ مالک میں دو حواشی مختصر تر ہیں۔ ان کے مقابلے میں نسخۂ مالک میں ۸۶ حاشیے مزید ہیں۔ ذیل میں صرف صفحے کا نمبر درج کرتا ہوں۔ جس صفحے پر ایک سے زیادہ حواشی کا اضافہ ہے، وہاں قوسین میں تعداد دے دی ہے۔

۱۱ ـ ۲۶ ـ ۲۹ (۲) ـ ۳۱ ـ ۳۲ ـ ۵۰ ـ ۵۳ (۲) ـ ۵۷ (۲) ـ ۵۹ ـ ۶۰ ـ ۶۱ ـ ۶۷ (۲) ـ ۶۸ ـ ۷۰ ـ ۸۸ ـ ۹۰ ـ ۹۲ ـ ۹۳ ـ ۹۸ ـ ۱۴۹ ـ ۱۷۹ (۲) ـ ۱۸۱ (۲) ـ ۱۸۹ ـ ۱۹۳ ـ ۲۰۰ ـ ۲۰۴ (۲) ـ ۲۱۷ (۳) ـ ۲۱۹ (۲) ـ ۲۲۰ ـ ۲۲۱ (۵) ـ ۲۲۲ ـ ۲۲۳ ـ ۲۲۵ ـ ۲۲۶ (۳) ـ ۲۲۷ ـ ۲۲۸ ـ ۲۲۹ ـ ۲۳۰ ـ ۲۳۱ ـ ۲۳۳ ـ ۲۳۴ ـ ۲۴۲ ـ ۲۴۳ ـ ۲۷۶ ـ ۲۷۷ ـ ۲۸۶ (۲) ـ ۲۹۳ ـ ۲۹۹ ـ ۳۰۶ ـ ۳۰۹ (۲) ـ ۳۱۰ ـ ۳۱۵ ـ ۳۱۶ ـ ۳۱۸ (۲) ـ ۳۲۲ (۲) ـ ۳۲۹ ـ ۳۳۳ ـ ۳۵۰ ـ ۳۶۹ (۲) ـ ۳۷۳ ـ ۳۸۶ ـ ۳۹۰ (۲) ـ ۳۹۸ ـ

ذیل کے دس حواشی میں نسخۂ مالک میں قدرے اضافہ ہے:

۳ـ۴۳ـ۸۵ـ۱۹۵ـ۲۰۱ـ۲۹۵ـ۳۳۷ (نمبر۱) ـ۳۵۳ـ۳۶۳ـ۳۹۱ـ

مزید اور طویل تر حواشی کی مجموعی تعداد ۹۶ ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے زیادہ تر مالک رام ہی کے لکھے ہوئے ہوں گے لیکن بعض عبدالستار صدیقی کے بھی ہیں مثلاً ص ۱۷۹ پر۔ یہ کس طرح در آئے؟ مالک رام نے اپنے نسخے پر عبدالستار صدیقی سے نظرِثانی نہیں کرائی۔

عبدالستار صدیقی اپنے مکتوب بنام عقیل حسین موسوی کراچی، مورخہ ۸ اپریل ۱۹۶۵ء میں لکھتے ہیں:

"پھر ایک بار علی گڑھ پہنچ کر پہلی اور دوسری دونوں جلدوں کے مسودے اپنے نظرِثانی کیے ہوئے انجمن سے انھیں دلا دیے" (۳۱)

"پہلی جلد کا نظرِ ثانی کیا ہوا مسودہ" کیا ہندوستانی اکیڈمی سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہونے والی جلد سے پیش تر کا پریس کا مسودہ ہے یا مہیش پرشاد کی مطبوعہ کتاب پر مزید نظرِ ثانی کیا ہوا؟ پہلی صورت مشکل ہے، کیونکہ کاتب کتابت کرتے وقت مسودے کی جلد اکھاڑ دیتا ہے اور طباعت کے بعد اس کے منتشر اوراق ادھر ادھر ہو جاتے ہیں عبدالستار صدیقی نے مطبوعہ جلد اوّل پر نظرِ ثانی کی ہو گی اور اس میں حواشی کا اضافہ کیا ہو گا۔ کیا بعید ہے کہ ان میں سے بعض حواشی کے بالواسطہ مصنّف اصلی مالک رام ہی ہوں۔ مالک رام "ہماری زبان" کے مضمون میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے نسخۂ مہیش کی اشاعت کے بعد اس نسخے کے بعض اغلاط مہیش پرشاد کو لکھ بھیجے تھے۔ مہیش پرشاد نے وہ خط عبدالستار صدیقی کو دے دیا جس کا ذکر خود صدیقی صاحب نے مالک رام سے کیا۔ (۳۲) اگر صدیقی صاحب نے مہیش پرشاد کی مطبوعہ جلد پر نظرِ ثانی کی ہو گی تو مالک رام کے نشان زدہ اغلاط کی فٹ نوٹ میں ہاتھ سے اصلاح کر لی ہو گی۔ اس طرح عین ممکن ہے کہ نسخۂ مالک کے جن مزید حواشی کے آگے "ع ص" لکھا ہے، ان میں سے بعض مالک رام کے محولۂ بالا خط سے لیے گئے ہوں گے اور جو نئے حواشی عبدالستار صدیقی ہی کی تصنیف ہیں، کم از کم انھیں معرضِ اشاعت میں لانے کا سہرا نسخۂ مالک رام کے سر ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ خطوطِ غالب کے دونوں ایڈیشنوں کے حواشی نہایت مختصر اور غیر اہم ہیں۔ میں نسخۂ مالک کے چند حواشی کے بارے میں دو لفظ عرض کرنا چاہتا ہوں:

۱۔ نسخۂ مالک میں ص ۳۰۰ پر خط نمبر ۳۱۳ بنام مجروح میں نسخۂ مہیش کا نوٹ نقل کیا ہے کہ

"میں نے غلطی سے اس خط کے ساتھ خط ۲۹۸ کو ملا دیا ہے"۔

نسخۂ مہیش کے لیے نمبر ۲۹۸ صحیح تھا لیکن نسخۂ مالک میں ۲۹۸ یوسف علی خاں کے نام ہے۔ نسخۂ مہیش کا ۲۹۸ نسخۂ مالک میں دراصل نمبر ۳۱۸ ہے اور یہی لکھنا چاہیے تھا۔ اس چوک سے قطعِ نظر، نسخۂ مالک میں خط ۳۷۹، ۳۸۷ وغیرہ کے حواشی میں دوسرے خطوں

کے حوالے ہیں اور ان میں نسخۂ حمیش کے خط کا نمبر درست کر کے لکھا ہے۔

۲۔ نسخۂ حمیش میں ص ۲۴۰ پر مجروح کے نام کے ایک خط کی عبارت ہے۔

"انگریزی سرکار سے دس ہزار روپے سال ٹھہرے۔ اس میں سے مجھ کو ملے ساڑھے سات سو روپے سال۔ ایک صاحب نے نہ دیے مگر تین ہزار روپے سال"۔

آخری جملے پر عبدالستار صدیقی حاشیہ لکھتے ہیں:

"اس جملے کا مطلب کچھ صاف نہیں۔ ع۔ ص"۔

مہر نے اپنے نسخے میں اس عبارت کو یوں صحیح کر کے لکھا:

"انگریزی سرکار سے دس ہزار روپے سالانہ ٹھہرے۔ ایک صاحب نے نہ دیے مگر تین ہزار روپے سال۔ اس میں سے مجھ کو ملے ساڑھے سات سو روپے سال"۔ (ص ۲۸۸)

عبارت کا جھول نکل گیا۔ مہر نے عبدالستار صدیقی کا حاشیہ نکال دیا کہ وہ اب غیر ضروری تھا۔ مالک رام نے بھی ص ۳۱۴ پر جملوں میں مہر کی ترتیب رکھی لیکن "سالانہ ٹھہرے" کی جگہ نسخۂ حمیش کی طرح "سال ٹھہرے" لکھا اور انھوں نے بھی نسخۂ حمیش کا حاشیہ نہیں دیا۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ نسخۂ مالک میں آنکھ موند کے نسخۂ حمیش کا متن نقل نہیں کیا گیا بلکہ حسبِ ضرورت اس میں اصلاح و ترمیم کی گئی ہے۔

۳۔ ص ۳۸۱، ع: جز دفعِ غم زیادہ نبودہ ست کام ما۔ اس غزل کے لیے نسخۂ حمیش میں ص ۳۴۲ پر عبدالستار صدیقی نے حاشیہ لکھا کہ "یہ کلیات میں نہیں ہے"۔ مہر نے اپنے نسخے میں ص ۲۷ پر یہ حاشیہ حذف کر دیا ہے۔ مالک رام نے اپنے نسخے میں ص ۳۸۱ پر، صحیح تر حاشیہ لکھا کہ "یہ سبد چین میں ہے"۔ وہ "سبد چین" کو مرتب کر چکے تھے اس لیے کہ اس کے عارف تھے۔

۴۔ مالک رام کا ص ۳۴۷ کا نوٹ بہت مفصل اور پُر از معلومات ہے۔

۵۔ شیونرائن آرام آگرے سے ایک پندرہ روزہ رسالہ "معیار الشعرا" نکالتے تھے

نسخۂ مالک میں ص ۳۳۱ کے دو خطوں نمبر ۵۱۶ ، ۵۱۷ میں غلطی سے اس کا نام "معیار الاشعار" چھپ گیا ہے۔ یہ صرف نسخۂ مہیش اور نسخۂ مالک میں نہیں بلکہ ان کے ماخذ میں بھی ہے۔ "معیار الاشعار" محقق طوسی کی کتاب کا نام ہے۔ نسخۂ مہیش میں ص ۲۹۴ پر عبدالستار صدیقی کا نوٹ ہے: "غالباً وہی معیار الشعرا مراد ہے"۔ یہ ضروری نوٹ نسخۂ مالک میں سہوِ کتابت کی وجہ سے حذف ہو گیا ہے، کیونکہ دونوں خطوں میں "معیار الاشعار" پر حوالے کا نشان (۵) بنا ہے لیکن فٹ نوٹ میں اس کی صراحت مذکور ہونے سے رہ گئی۔

مقدّمہ

مرتّبِ متن سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایک محققانہ مقدّمہ بھی لکھے گا جس میں اس متن سے متعلق ضروری معلومات دے گا، بالخصوص ان قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی تفصیل جن کو اس نے پیشِ نظر رکھا ہے۔

مہیش پرشاد نے اپنے دیباچے میں صرف ان ذرائع کا ذکر کیا جن سے انھیں مختلف خطوط ملے۔ متن کا مقدّمہ لکھنے کا کام انھوں نے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے سپرد کر دیا۔ مہیش پرشاد کو ماہرینِ غالبیات میں شمار کیا جاتا ہے، لیکن غالب کے سلسلے میں انھوں نے صرف اس کتاب کے سوا کوئی کام نہیں کیا۔ چند مضامین ہو سکتے ہیں، لیکن کتاب صرف یہی ہے جس میں انھوں نے یہ کام کیا کہ "اردوے معلّیٰ" اور "عودِ ہندی" کے ساتھ ساتھ کچھ دوسرے ذرائع سے بھی خطوط حاصل کیے۔ ان میں سے جن کی تاریخ کا تعین کر سکے، کیا اور انھیں تاریخی ترتیب سے مرتّب کیا۔ معلوم ہوتا ہے، انھوں نے متن کی بھی کسی قدر تصحیح کی، کیونکہ ان کے ایڈیشن کے متعدد حواشی کے آگے عبدالستار صدیقی کا نام نہیں۔ اور اس کے بعد مہیش پرشاد نے خوداعتمادی کی کمی دکھائی۔ یہ کیسے ماہرِ غالبیات تھے کہ اپنا تیار شدہ متن نظرِثانی کے لیے، نیز مقدّمہ لکھنے کے لیے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کو دے دیا؟ حد یہ ہے کہ دوسرے ایڈیشن کے لیے بھی وہ مرتّب کا یہ فریضہ عبدالستار صدیقی کے سپرد کرنا چاہتے تھے!

ڈاکٹر صدیقی اپنے خط، مورخہ ۸ اپریل ۱۹۴۵ء بنام عقیل حسن موسوی، میں لکھتے ہیں:

"منشی مہیش پرشاد مرحوم کی خواہش تھی کہ پہلے کی طرح اب بھی میں ہی کتاب کی نگرانی اور نظرِثانی کا کام انجام دوں"۔

("اردو تحقیق اور مالک رام"، ص ۴۴)

صدیقی صاحب عربی فارسی کے عالم تھے، لیکن غالبیات ان کا خصوصی موضوع نہ تھا معلوم ہوتا ہے۔ متن کی درستی میں انھوں نے مہیش پرشاد سے کم محنت نہیں کی، کیونکہ انھوں نے بھی خطوط کے ان تمام مجموعوں کو سامنے رکھا جن سے مہیش پرشاد نے ترتیب دی تھی۔ اپنے مقدمے میں عبدالستار صدیقی نے ان نسخوں کی تفصیل دی ہے طباعتِ متن کے بعد انھیں جو غلطیاں دکھائی دیں، وہ انھوں نے مقدمے ہی میں "استدراک" کے عنوان سے لکھ دی ہیں۔

مقدمے میں انھوں نے املاے غالب کی خصوصیات بھی گنائی ہیں۔ ستم یہ کیا ہے کہ مطبوعہ ایڈیشن میں غالب کے املا کی اس حد تک پیروی کی ہے کہ متن کو بالحروف ہی چھاپا ہے، یعنی: اوس، اودھر، اوٹھ، اوٹھا وغیرہ۔ یہ مکھی پر مکھی مارنے کے مترادف ہے غالب کا املا غالب کے عہد کے لیے تھا۔ آج کے عہد میں ہر مصنّف کی نگارشات آج کے املا میں لکھی جائیں گی، بشرطے کہ اس سے تلفظ میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔

ڈاکٹر صدیقی اطلاع دیتے ہیں:

"خطوطِ غالب کی دوسری جلد کے آخر میں کچھ ضمیمے اور اشاریے ہوں گے۔ انھیں میں ایک فہرست خطوں کی ہوگی اور اس میں ہر خط کے متعلق یہ بتایا جائے گا کہ وہ کہاں سے لیا گیا ہے"۔ (مقدمہ، ص وی)

افسوس کہ دوسری جلد شائع نہ ہو سکی۔

ڈاکٹر خلیق انجم اطلاع دیتے ہیں:

"دوسری جلد کا مسودہ انجمن نے حاصل کر لیا تھا۔ بدنصیبی سے دوسری جلد کا مسودہ انجمن سے گم ہو گیا"۔

("غالب کے خطوط"، جلد اوّل، ۱۹۸۴ء، ص ۱۶۰)

مالک رام کے ایڈیشن میں مہیش پرشاد کا دیباچہ موجود ہے۔ لیکن اس سے مفید تر عبدالستار صدیقی کا مقدمہ غیر حاضر ہے۔ انجمن کے جنرل سیکریٹری سرور صاحب نے ایک مختصر تعارف لکھ دیا اور بس۔ کتاب کی طباعت اچھی نہیں لیکن پُر از اغلاط بھی نہیں۔ ایک نجی خط میں ڈاکٹر صدیقی نے اس کتاب کی جو تنقیص کی ہے۔ اس کا جواز سمجھ میں نہیں آتا۔ کراچی کے عقیل حسن موسوی کو انھوں نے ۸ اپریل ۱۹۶۵ء کو ایک خط لکھا جو "تحریک" مارچ ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔

ایک اقتباس:

"اب جو کتاب چھپ کر آئی اور ایک نسخہ مجھے ملا تو کیا لکھوں کہ مجھ پر کیا بیت گئی۔ ظاہر تو جیسا کچھ ہے۔ وہ سب پر عیاں ہے۔ باطن اس سے کہیں زیادہ خراب اور مسخ۔ خط غلط، معنی غلط، انشا غلط، املا غلط۔ نہ صحت کا لحاظ، نہ مآخذ کا پتا۔ حواشی میں مخففات موجود۔ البتہ ان کی حیثیت طلسمات کی سی ہو کر رہ گئی۔ جو وضاحتیں کتاب کے ہندوستانی اکیڈمی والے ایڈیشن میں میرے معروضات کے ذریعے ہوتی تھیں۔ وہ یک قلم خارج۔ اب اس طلسم کو کھولے تو کون اور کھلے تو کیونکر"۔

("اردو تحقیق اور مالک رام"۔ ص ۲۵)

ان کے اعتراضات بڑی حد تک بجا ہیں۔ لیکن لہجے کی تندی کی نفسیاتی وجہ یہی ہو گی کہ نسخۂ مہیش پرشاد کے اوپر اعتراف تھا کہ عبدالستار صدیقی نے نظرثانی کی۔ نیز ان کا مقدمہ شاملِ کتاب تھا۔ انجمن کے ایڈیشن میں ان کا مقدمہ بھی نہیں اور نظرثانی والا فقرہ بھی نہیں۔ ان کے مقدمے کے فقدان کے باعث مآخذ کا پتا بھی نہ رہا اور حواشی کے مخففات کی وضاحت بھی جاتی رہی یعنی ع م۔ م ۱۔ م ۲۔ خ۔ خ ص۔ مخ وغیرہ سے کیا اشارہ ہے۔ واضح نہ رہا۔ معلوم نہیں۔ ان کا مقدمہ سرور صاحب کے فیصلے کے تحت نکالا گیا یا مالک رام کے ایما پر۔ اگر مالک رام کوئی مفصل مقدمہ لکھتے تو مخ اول کے مقدمے کو خارج کرنے کا جواز تھا۔

مالک رام نے مقدمہ کیوں نہیں لکھا؟

"تحریک" دسمبر ۱۹۷۳ء میں ادارتی نوٹ کے سلسلے میں سرور صاحب کا ایک خط چھپا جو "اردو تحقیق اور مالک رام" کے ص ۱۱۸ پر ہے۔ اس خط، عبدالستار صدیقی کے خط ("تحریک" مارچ ۱۹۷۵ء) اور مالک رام کے مضمون ("ہماری زبان" ۸ مارچ ۱۹۷۵ء) کی مدد سے اس ایڈیشن کی جو سرگذشت تشکیل ہوتی ہے، وہ یوں ہے:

۱۹۴۱ء میں نسخۂ مہیش پرشاد جلدِ اوّل شائع ہوئی۔ مالک رام صاحب اس وقت مصر میں مقیم تھے۔ مہیش پرشاد نے ایک جلد انھیں تحفتاً بھیجی۔ مالک رام صاحب کو اس میں جو اغلاط نظر آئیں، انھیں لکھ کر مصنف کے پاس بھیج دیا۔ مہیش پرشاد کا انتقال اگست ۱۹۵۱ء میں ہوا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مالک رام صاحب نے ان سے خواہش ظاہر کی کہ وہ خطوطِ غالب کی ترتیب ثانی کرنا چاہتے ہیں عبدالستار صاحب نے اس امر کو پوشیدہ رکھ کر انجمن ترقی اردو کو تجویز کی کہ اس کام کے لیے مالک رام کو کہا جائے۔ ۱۹۵۶ء کے آخر یا ۱۹۵۷ء کے شروع میں انجمن نے مالک رام کو "خطوطِ غالب" کی دونوں جلدیں نئے سرے سے مرتب کرنے کا کام سونپا اس سلسلے میں انھیں مہیش پرشاد کی ترتیب دی ہوئی اور عبدالستار صدیقی کی نظرِثانی کی ہوئی دونوں جلدوں کے مسودے سونپ دیے گئے۔ میرا خیال ہے کہ جلدِ اوّل مطبوعہ پر ترمیم و اضافے رہے ہوں گے اور جلدِ دوم کا ہاتھ سے لکھا مسودہ ہو گا۔

مہیش پرشاد کی جلد اوّل کے اسقام سے وہ پہلے ہی واقف تھے۔ انھوں نے اسی سال پہلی جلد مرتب کر دی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی مدد سے ۱۹۵۷ء کے آخر تک کتابت مکمل کرا دی۔ کتابت کی ہوئی کاپیاں انجمن کے سپرد کر کے وہ اپریل ۱۹۵۸ء میں ہندوستان سے باہر چلے گئے۔ انھوں نے سوچا تھا کہ جب طباعت ہو گی، مقدمہ لکھ دیں گے۔ انجمن کے کاموں کے لیت و لعل سے سب واقف ہیں۔ کتابت کی کاپیاں کئی سال پڑی رہیں۔ پھر احساس ہوا کہ طباعت میں بہت زیادہ التوا ہو گیا ہے۔ انجمن نے مالک رام صاحب کی عدم موجودگی اور لاعلمی میں ۱۹۶۲ء میں طباعت کرا دی۔ گو کتاب پر ۱۹۶۲ء درج ہے۔ طباعت و اشاعت کے بعد ان کے یورپ کے پتے پر انھیں

کوئی جلد بھیجی بھی نہیں گئی۔ ۱۹۶۳ء میں جب وہ ہندوستان آئے اور انھوں نے مکتبہ جامعہ بمبئی کی دکان پر مطبوعہ جلد دیکھی تو انھیں معلوم ہوا کہ کتاب چھپ گئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انجمن نے ان سے کہا ہی نہیں کہ وہ کتاب پر مقدمہ لکھ کر بھیج دیں۔ یورپ چٹھی لکھی جا سکتی تھی اور یورپ میں بیٹھے بھی مقدمہ لکھا جا سکتا تھا لیکن ان سے کسی نے کہا ہو جب تو۔

انجمن کے ایڈیشن کا مرتّب؟

اعتراض کیا گیا ہے کہ اس ایڈیشن پر مرتّب کی حیثیت سے مہیش پرشاد کا نام کیوں درج نہیں اور مالک رام کا نام کیوں درج ہے۔ منجملہ دوسرے حضرات کے سرور صاحب تک کا یہ عقیدہ ہے:

"دراصل مالک رام نے یہ خط مرتّب نہیں کیے"۔ (۴۳)

آئیے، ذرا دیکھیں کہ کیا یہ ایڈیشن مہیش پرشاد کا نسخہ ہے یا مالک رام نے اس کی تشکیلِ نو کی ہے۔ کم از کم سرور صاحب تو یہی سمجھتے ہیں کہ مالک رام نے مہیش پرشاد کے نسخے کی صرف طباعت کی تصحیح کی۔ لکھتے ہیں:

"کتاب، عرصہ ہوا، مالک رام کو نیا ایڈیشن تیار کرنے کے لیے دی گئی تھی وہ طباعت کی تصحیح کر کے گوپی چند نارنگ کو کتاب دے گئے"۔ (۴۴)

لیکن مارچ ۱۹۶۳ء میں، جب اس کتاب کے بارے میں ان کا حافظہ تازہ تھا، ان کی رائے مختلف تھی۔ اپنے تعارف میں لکھتے ہیں:

"خطوطِ غالب کے نئے ایڈیشن کی تیاری آسان نہ تھی۔ غلام رسول مہر نے اس عرصے میں ان خطوط سے بھی فائدہ اٹھاتے ہوئے دو جلدوں میں غالب کے خطوط یکجا کر دیے تھے۔ پھر کچھ نیا مواد بھی سامنے آیا تھا، مگر مالک رام صاحب نے نہایت جاں فشانی سے سارے کام کا جائزہ لیا۔ جہاں جہاں ضروری سمجھا، اہم واقعات کی صحت کی، جہاں اضافہ مناسب معلوم ہوا اضافہ کیا اور اس طرح ایک ایسا ایڈیشن تیار کر دیا جسے فخر کے ساتھ پیش کیا

جا سکتا ہے۔ اس طرح نہ صرف غالب کے ان خطوط کا ایک صحیح ایڈیشن تیار ہو گیا بلکہ مولوی مہیش پرشاد مرحوم کے کام کا بھی مناسب اعتراف ہو گیا "۔
("خطوط غالب" ، مرتبہ مالک رام)

جو یہ سب کرے ، اسے مرتب کہنے میں کیا تامل ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ پیچھے تفصیل دی جا چکی ہے ، اس ترتیب میں مالک رام صاحب کا بہرہ یہ ہے :

ا۔ ۲۹ خطوں کا اضافہ کیا جن میں سے ۲۰ "نادراتِ غالب" سے لیے ، دو غلام رسول مہر کے نسخے سے اور چار دوسرے ماخذوں سے۔ ان میں سے چند غیر مطبوعہ تھے جو خود ان کے ذخیرے سے لیے گئے۔ (۳۵)

۲۔ نسخۂ مہر سے لے کر ایک مکتوب الیہ کا غلط انتساب درست کیا۔

۳۔ ۱۲ خطوں کی تاریخوں میں ترمیم و اصلاح کی اور اس کی مناسبت سے خطوں کی ترتیب بھی بدلی۔

۴۔ کم از کم ۲۸ حواشی بڑھائے۔

۵۔ بعض خطوں کے متن کی درستی کی۔

اتنی تبدیلیوں کے بعد انجمن کا ایڈیشن " مہیش پرشاد کے ایڈیشن کی دوسری جلد چھاپ نہیں رہتا ، اور مالک رام مرتب کا درجہ پا جاتے ہیں۔ ذرا دیکھیں کہ دوسرے متون کے مرتبینِ ثانی نے کیا کیا ہے :

ا۔ کلیاتِ ولی کا پہلا ایڈیشن احسن مارہروی نے ترتیب دیا تھا۔ دوسرے ایڈیشن کے مرتب ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ہیں۔ انھوں نے متن میں کچھ ترمیم و اضافہ کیا ہے اور احسن کا طویل مقدمہ خارج کر کے ایک مختصر مقدمہ لکھا ہے۔

ب۔ ڈاکٹر خلیق انجم اور گوپی چند نارنگ نے عبدالحق کی "معراج العاشقین" کو اپنے مقدمے اور اپنے نام سے شائع کیا۔ خلیق انجم نے خواجہ بندہ نواز کی کچھ منظومات کا ضرور اضافہ کیا۔

ج۔ شمیم انہونوی نے عبدالحق کے "سب رس" کو اپنے مقدمے کے ساتھ شائع

کر کے اپنی ترتیب قرار دیا۔

د۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے عبدالباری آسی کی "کلیاتِ میر"، مسیح الزماں کے "مراثی میر" اور میری دریافت کردہ تین نئی مثنویوں کو شامل کر کے جیوں کا تیوں چھاپ دیا۔

ہ۔ ڈاکٹر مسیح الزماں نے مسعود حسن رضوی کی "اندر سبھا" کے متن کو اپنے مقدمے کے ساتھ اپنے نام سے شائع کیا۔

و۔ زکی کاکوروی نے مسعود حسن رضوی کی مرتّبہ "فسانۂ عبرت" کو خفیف سی ترمیم کے ساتھ اپنے نام سے شائع کیا۔

ز۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے عبدالحق کی "رانی کیتکی کی کہانی" کو اپنے مقدّمے کے ساتھ اپنے نام سے شائع کیا۔

ح۔ ہندی میں ڈاکٹر شری رام شرما نے "خطوطِ غالب" کی دو جلدیں چھاپی ہیں جن میں اردو متن جیوں کا تیوں ہے۔ جلدِ اوّل میں مہیش پرشاد کے نسخے کو ہو بہو نقل کر دیا ہے۔ حواشی صرف مشکل الفاظ کے معنی لکھنے تک محدود ہیں۔ دوسری جلد میں آفاق کی "نادراتِ غالب" اور مولانا مہر کی "خطوطِ غالب" سے استفادہ کیا ہے اور دونوں جلدوں پر مرتّب کی حیثیت سے شری رام شرما کا نام ہے۔

ان سب حضرات نے پہلے مرتّب کے متن میں کوئی معتدبہٖ تبدیلی نہیں کی بلکہ اکثر صورتوں میں کوئی تبدیلی کی ہی نہیں، صرف پہلے مرتّب کا مقدّمہ نکال کر اپنا مقدّمہ لکھ دیا اور مرتّبِ اوّل کا نام نکال دیا۔ کسی نے ان پر گرفت نہیں کی۔ مکتبۂ جامعہ سے جو معیاری ادب سیریز میں کلاسیکی کتابیں شائع ہو رہی ہیں، ان کے مرتّب ایک دو قدیم ایڈیشنوں کی بنا پر متن ترتیب دیتے ہیں، چار صفحوں کا مقدّمہ لکھتے ہیں۔ فرہنگ کوئی دیتا ہے، کوئی نہیں۔ بہرحال مرتّب کا رتبہ ہر ایک حاصل کر لیتا ہے۔

اردو کی اس روایت کو دیکھتے ہوئے اگر مالک رام ایک مفصّل مقدّمہ لکھ دیتے اور مہیش پرشاد کا دیباچہ خارج کر کے مرتّب کی حیثیت سے صرف اپنا نام لکھ دیتے تو بھی موردِ اعتراض نہ ہوتے۔ واضح ہو کہ مقدّمہ لکھنا ضروری تھا۔ بصورتِ موجودہ بھی جو کچھ

انھوں نے کیا ہے، اس کی بنا پر وہ شریکِ مرتّب قرار پاتے ہیں۔ میں نے "تحریک" میں ایک مراسلے میں تجویز کی تھی کہ انجمن کے ایڈیشن کے سرورق پر نام یوں دیا جائے:

مرتّب: مہیش پرشاد

تصحیح و اضافہ از مالک رام ("تحریک"، فروری ۱۹۵۷ء، ص ۸)

اب میں مالک رام کے اضافوں کے تفصیلی جائزے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس کھٹ راگ کی کوئی ضرورت نہیں۔ سیدھا سادا "مرتّبین: مہیش پرشاد و مالک رام" لکھنا چاہیے تھا۔

کیا مہیش پرشاد کا نام مالک رام کے ایما پر حذف کیا گیا؟ ۱۹۷۵ء کے اوائل میں یہ بحث زوروں پر تھی۔ میں نے انجمن ترقّیِ اردو ہند کے اس وقت کے جنرل سیکریٹری پروفیسر سرور سے یہ سوال کیا تھا۔ انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس مضمون کی تحریر کے وقت پھر یہ سوال کیا۔ اب کی بار انھوں نے سری نگر سے جواب بھیجا جو مجھے ۲۶ ستمبر ۱۹۷۸ء کو ملا۔ اس میں لکھتے ہیں:

"آپ نے کسی پچھلے خط میں مالک رام کے مرتبہ خطوطِ غالب کے سلسلے میں پوچھا۔ اب یہ یاد نہیں کہ مالک رام صاحب کو اس کا علم تھا یا نہیں، ان کا نام ان کے ایما پر دیا گیا تھا۔ انجمن کی روداد سے پتا چلے گا۔ میں نے دیباچے میں پوزیشن واضح کر دی تھی۔ 'تحریک' میں میرا ایک خط بھی اس سلسلے میں چھپا تھا۔ بہرحال یہ احساس ہوتا ہے کہ مہیش پرشاد کا نام اور اس کے بعد مالک رام کا نام (اضافے اور نظرِ ثانی) کے حوالے کے ساتھ دینا چاہیے۔"

انھوں نے کھل کر کچھ نہیں بتایا لیکن ادھر شاہد ماہلی کی کتاب "مالک رام (محقق اور دانشور)" میں وضاحت کی ہے:

"انجمن ترقّیِ اردو (ہند) سے اس کا دوسرا ایڈیشن جس میں مالک رام صاحب نے خاصا اضافہ کیا تھا، جب شائع ہوا تو سرورق پر مہیش پرشاد کا نام

نہ تھا، صرف میرے پیش لفظ میں اس کی طرف اشارہ تھا۔ دراصل مالک رام صاحب اس زمانے میں ہندوستان سے باہر تھے اور مسودہ جن صاحب کو چھپوانے کے لیے دہلی میں دیا گیا تھا، انھوں نے اس کا خیال نہ رکھا اور جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے میں بھی اس مرحلے پر کام کی نگرانی نہ کر سکا۔ اس لیے یہ کوتاہی رہ گئی لیکن مالک رام صاحب کے کام کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے"۔

("ہماری زبان" ۱۵، مئی ۱۹۹۳ء، ص ۹)

مالک رام نے "ہماری زبان" میں سب کچھ صراحت کر دی اور اس کے بعد شبہے کا کوئی مقام نہیں رہ جاتا۔ میں ان کے بیان کے کسی لفظ پر شک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ۱۹۹۳ء میں جب انھوں نے پہلی بار یہ مطبوعہ ایڈیشن دیکھا تو مہیش پرشاد کا نام نہ دیکھ کر سرور صاحب سے شکایت کی۔ (۳۶)

"مرتب کی حیثیت سے میرا نام چھپا ہے۔ صحیح یہ ہوتا کہ پہلے مہیش پرشاد مرحوم کا نام ہوتا اور ان کے بعد میرا مرتبِ ثانی کی حیثیت سے"۔

پھر وہ لکھتے ہیں:

"خطوط غالب کا جو ایڈیشن میرے نام سے شائع ہوا ہے، اس میں جتنا اضافہ ہے اس کے پیش نظر یہ بالکل نئی کتاب ہے، لیکن چونکہ میں اسے صرف اپنے نام سے نہیں شائع کرنا چاہتا تھا اور منشی صاحب مرحوم کے کام کا اعتراف اپنا فرض خیال کرتا تھا، بالخصوص جبکہ ان کی کتاب کے حواشی بھی ساتھ شائع ہو رہے تھے، اس لیے صحیح بات یہ ہوتی کہ ان کا نام اول چھپتا اور میرا اس کے بعد۔ اگر ناشر نے ایسا نہیں کیا تو یہ میری اجازت یا استصوابِ رائے سے نہیں ہوا اور یہ میرے منشا کے بھی خلاف ہے"۔

("خطوطِ غالب کی ترتیب نو"، "ہماری زبان" ۸، مارچ ۱۹۹۵ء)

اب ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ مہیش پرشاد کا نام حذف کرنے کا

فیصلہ صرف انجمنِ ترقی اردو کا تھا جس کا مالک رام کو علم بھی نہ تھا۔ اس فیصلے میں انجمن کی کوئی بدنیتی نہ تھی بلکہ یہ عدمِ اعتماد کا نتیجہ تھا۔ آخری شہادت انجمن کے موجودہ جنرل سیکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کی ہے۔ غالب کے خطوط کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

"خطوطِ غالب کا دوسرا ایڈیشن انجمن ترقی اردو سے ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ اس وقت مالک رام صاحب ہندوستان سے باہر تھے۔ انجمن کی غلطی سے اس کتاب پر مرتب کی حیثیت سے مالک رام صاحب کا نام چھپ گیا"۔

(جلد اول، ص ۵۳)

اعتراض ہے کہ اگر مالک رام مہیش پرشاد کو اس کتاب کا مرتب تسلیم کرتے ہیں تو انھوں نے اپنی کتابوں مثلاً گلِ رعنا میں "خطوطِ غالب مرتبہ مالک رام" کے نام سے کیوں حوالہ دیا۔ وجہ ظاہر ہے کہ وہ انجمن کے ۱۹۴۲ء کے ایڈیشن کا حوالہ دے رہے ہیں جس پر مرتب کی حیثیت سے مالک رام کا نام چھپا ہے۔ کیا ہر جگہ حوالہ دے رہے ہیں جس پر مرتب کی حیثیت سے مالک رام کا نام چھپا ہے۔ کیا ہر جگہ حوالہ دیتے وقت وہ یہ داستان دہرایا کرتے:

"خطوطِ غالب مرتبہ مہیش پرشاد، ناشر انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۴۲ء۔ میرے علم کے بغیر اس ایڈیشن پر مرتب کی حیثیت سے صرف میرا نام چھپ گیا ہے"؟

اگر معترضین کے اعتراض کے مطابق اس کتاب کا حوالہ "خطوط غالب مرتبہ مہیش پرشاد، انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۲ء" لکھ کر دیں تو کیا کسی قاری کی اس ایڈیشن تک رسائی ہو سکتی ہے؟ واضح ہو کہ مالک رام، مہیش پرشاد کا نام شامل کرنے کے حق میں ہیں لیکن اپنا نام خارج کرنے کو نہیں کہتے۔ ستمبر ۱۹۸۷ء میں سرور صاحب کا بھی یہی بیان تھا۔ "ذکرِ غالب" طبع پنجم ۱۹۷۶ء میں مالک رام نے کتابیات میں اس کتاب کا نام یوں دیا ہے۔ "خطوطِ غالب (مرتبہ مہیش پرشاد) (مالک رام)، سرفراز قومی پریس لکھنؤ، ۱۹۴۲ء"۔ (ص ۲۵۸)

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی غلط ہے، کیونکہ اس سے غلط فہمی ہو گی۔ فرض کیجیے، پاکستان

میں کوئی اجنبی قاری کسی لائبریری میں یہ ایڈیشن ڈھونڈنا چاہے تو مہیش پرشاد و مالک رام کے ملے جلے ناموں کے ساتھ کوئی کتاب ملے گی ہی نہیں۔ "مالک رام، ایک مطالعہ" اور "مالک نامہ" کے آخر میں شامل حبیبہ بیگم کی "توقیتِ مالک رام" میں ان کی جملہ تصانیف و تالیفات کی تفصیل ہے۔ اس میں "مرتب کردہ کتابیں" کے تحت اس کتاب کا نام یوں ہے:

"خطوطِ غالب (منشی مہیش پرشاد)، ۱۹۴۱ء، علی گڑھ"۔

میرا قیاس ہے کہ یہ فہرست مالک رام صاحب کو دکھائی گئی ہو گی۔ لیکن ۱۹۴۱ء میں مہیش پرشاد کے نام سے کوئی "خطوطِ غالب" نہیں ملتی۔ انجمن ترقی اردو ہند کے ۱۹۴۱ء کے "خطوطِ غالب" کے لیے "خطوطِ غالب مرتبۂ مالک رام" کے سوا اور کسی طرح حوالہ نہیں دیا جا سکتا، وہ میں دوں یا مالک رام۔ کتاب پر کیا لکھا ہونا چاہیے تھا غیر متعلق ہے۔ کتاب پر واقعی کیا لکھا ہے، لائبریری کی فہرست کے لیے صرف وہی اہم ہے۔ حوالہ انھیں الفاظ میں دیا جائے گا جن کے تحت کتاب لائبریری میں درج ہو گی۔

بہرحال اب ڈاکٹر خلیق انجم نے غالب کے خطوط کو جامعیت کے ساتھ چار جلدوں میں باحسن الوجوہ مرتب کر کے ہمیں مہیش پرشاد اور مالک رام کے ایڈیشنوں سے بڑی حد تک بے نیاز کر دیا ہے۔

عیارِ غالب

مالک رام سہ ماہی تحقیقی رسالے "تحریر" کے ایڈیٹر تھے۔ فروری ۱۹۶۹ء کے غالب نمبر کے لیے انھوں نے تقاضا کر کے بہت سے لوگوں سے مضامین لکھوائے۔ تمام مضامین صرف اسی پرچے کے لیے لکھے گئے۔ پہلے سے موجود مضامین کو مرتب کرنا آسان کام ہے، خاص طور سے نئے مضامین لکھانا اور پھر ان کو ترتیب دینا زیادہ کھکیڑ طلب ہے۔ مدیر نے طے کیا کہ اس شمارے کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ اس کا نام "عیارِ غالب" رکھا گیا۔ اس کے تین مضامین کی مالک رام بطورِ خاص داد دیتے ہیں کیونکہ وہ عام لیکھ سے ہٹ کر دوسرے انداز کے ہیں، وہ یہ ہیں:

غالب کی صحیح تاریخ ولادت — سید صمد حسین رضوی

غالب، ایک نفسیاتی مطالعہ — ڈاکٹر نریندر ناتھ رگ
غالب کی بیماریاں اور مرض الموت — ڈاکٹر الجلیل

اس میں مالک رام کے دو مضامین ہیں: ۱۔ 'توقیتِ غالب' ۲۔ غالب شناسی، جب اور اب'۔ ان کے بارے میں "فسانۂ غالب" اور "گفتارِ غالب" کی 'پیش گفتار' کے سلسلے میں لکھ چکا ہوں۔

یادگارِ غالب

مکتبۂ جامعہ دہلی "معیاری ادب سیریز" کے نام سے کلاسیکی کتابوں کے معیاری اور سستے ایڈیشن چھاپتا ہے۔ مالک رام نے اس کے لیے "یادگارِ غالب" مرتب کی۔ اس کے متن، بالخصوص فارسی حصے کی تصحیح کا کام مشکل تھا۔ لیکن مالک رام نے حیاتِ غالب کے معتبر ایڈیشنوں کی بنا پر اس کا متن تیار کیا او اس کے شروع میں چھ صفحوں کا ایک مقدمہ لکھا۔ یہ کتاب اگست ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کے اردو اور فارسی حصوں کو الگ الگ جلدوں میں چھاپا گیا ہے۔

"ارمغانِ مالک" جلدِ اول میں عرش ملسیانی نے مالک رام کی نگارشات کی جو فہرست دی ہے، اس میں "یادگارِ غالب" کو مرتبات کے تحت نہیں، 'محض' مقدمات' کے تحت دیا ہے (ص ۴۹)۔ "مالک رام، ایک مطالعہ" اور "مالک نامہ" کے آخر میں حبیبہ بیگم کی تیار کردہ جو 'توقیتِ مالک رام' دی ہے، اس میں کتابوں کے نام بھی ہیں ان میں مرتب کردہ کتابوں کے تحت بھی "یادگارِ غالب" کا نام نہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ فہرست مالک رام کے ایما پر تیار کی گئی ہو گی۔

حواشی

(۱) وزیرالحسن عابدی، "سبد چین" (لاہور، ۱۹۹۹ء)، ص ۱۲۶، بحوالہ ڈاکٹر معین الرحمان: "غالب کا علمی سرمایہ" (لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۲۳۳ حاشیہ۔

(۲) بحوالہ معین الرحمان: "غالب کا علمی سرمایہ" ، ص ۴۳، ۱۷۵ نیز ذکرِ غالب طبع پنجم، ص ۱۷۵۔

(۳) "نوائے ادب"، جنوری ۱۹۵۵ء، اپریل ۱۹۵۵ء، جولائی ۱۹۵۵ء، جولائی تا اکتوبر ۱۹۵۶ء، بحوالہ معین الرحمان۔

(۴) سلمان احمد، "ترقیِ اردو بورڈ کا لغت اور مالک رام"، مشمولہ "اردو تحقیق اور مالک رام"، ص ۱۷۵۔ ظاہرا سلمان احمد ایک فرضی نام ہے۔ اصل مضمون نگار سوئے عالم ہے جسے اپنے نام سے لکھنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

(۵) "اردو تحقیق اور مالک رام"، ص ۸۳۔

(۶) "نسخۂ عرشی طبعِ ثانی سے متعلق کچھ معروضات"، "رموزِ غالب"، ۱۹۷۶ء، ص ۸۱۔

(۷) "اردو تحقیق اور مالک رام"، ۶۷۔

(۸) "گلِ رعنا"، ص ۷۸، مئی ۱۹۷۰ء۔

(۹) مقدمہ "مکاتیبِ غالب"، ص ۱۵۳، بحوالہ "اردو تحقیق اور مالک رام"، ص ۹۸۔

(۱۰) مقدمہ "مکاتیبِ غالب"، ص ۲۲۹، بحوالہ "اردو تحقیق اور مالک رام"، ص ۱۷۔

(۱۱) "اردو تحقیق اور مالک رام"، ص ۷۰۔

(۱۲) ایضاً، ص ۷۷۔

(۱۳) ایضاً، ص ۷۹، سطر ۳۔

(۱۴) "دیوانِ غالب"، آزاد کتاب گھر، ص ۳۔

(۱۵) " مخطوطات، تلاش، قرأت، ترتیب "، " آج کل "، تحقیق نمبر، اگست ۱۹۷۶ء
ص ۱۱۹۔
(۱۶) " اردو تحقیق پر ایک نظر، حقائق "، ص ۲۰۸۔
(۱۷) " اردو تحقیق اور مالک رام "، ص ۸۳۔
(۱۸) ایضاً، ص ۸۸۔
(۱۹) نسخۂ عرشی طبع اول، ص ۳۳ھ
(۲۰) " اردو تحقیق اور مالک رام "، ص ۹۷۔
(۲۱) " تحقیق و تصحیح متن کے مسائل "، " نقوش "، ص ۱۹،۱۸، مارچ ۱۹۴۳ء۔
(۲۲) " اردو تحقیق پر ایک نظر "، انجمنِ اساتذۂ اردو جامعاتِ ہند کی لکھنؤ کانفرنس کے
شعبۂ تحقیق کا خطبۂ صدارت، مشمولہ حقائق، ص ۲۸۔
(۲۳) " اردو تحقیق اور مالک رام "، ص ۸۷۔ " قاعدہ یہ ہے کہ صحیح یا مرجح صورت
کو متن کی جگہ دی جاتی ہے "۔
(۲۴) مقدمہ ص ب از عبدالستار صدیقی، " خطوطِ غالب "، جلد اول
مرتبہ مہیش پرشاد، الہ آباد، ۱۹۴۱ء۔
(۲۵) " خطوطِ غالب کی ترتیبِ نو " از مالک رام، " ہماری زبان "، ۸، مارچ ۱۹۷۵ء
ص ۱۔
(۲۶) " خطوطِ غالب "، مرتبہ غلام رسول مہر۔ تعارف، ص ر، کتاب منزل، کشمیری بازار
لاہور، طبع دوم۔
(۲۷) " خطوطِ غالب "، مرتبہ مہر، ص ۲۲ کا حاشیہ۔
(۲۸) " ہماری زبان "، ۸، مارچ ۱۹۷۵ء ص ۱۔
(۲۹) " خطوطِ غالب کی ترتیبِ نو " از مالک رام، " ہماری زبان "، ۸، مارچ ۱۹۷۵ء۔
(۳۰) " مکاتیب غالب "، مرتبۂ مولانا عرشی، متن ص ۱۱۱، طبع اوّل، ۱۹۳۷ء۔
(۳۱) شائع شدہ اردو لیٹر، ۱۵ فروری ۱۹۷۵ء، نیز " تحریک " مارچ ۱۹۷۵ء، نیز " کتاب اردو
تحقیق اور مالک رام "، ۱۹۷۵ء، ص ۱۲۳۔

(۳۲) "خطوطِ غالب کی ترتیبِ نو"، "ہماری زبان" ۸، مارچ ۱۹۷۵ء، ص ۱۔
(۳۳) "تحریک" دسمبر ۱۹۷۳ء، نیز "اردو تحقیق اور مالک رام"، ص ۱۱۸۔
(۳۴) ایضاً۔
(۳۵) "خطوطِ غالب کی ترتیبِ نو" از مالک رام ہماری زبان" ۸، مارچ ۱۹۷۵ء، ص۲۔
(۳۶) "خطوطِ غالب کی ترتیبِ نو" از مالک رام، "ہماری زبان"، ص ۲۷، ۸ مارچ ۱۹۷۵ء۔

پانچواں باب

مجموعی جائزہ

غالبیات کے باب میں مالک رام کے عریض و عمیق کاموں کی یہ مختصر کہانی ہے جو گزشتہ اوراق میں سنائی گئی۔ اس سے ان کے کارناموں کا اندازہ تو ہو جاتا ہے لیکن یہ جائزہ ان کی تحریروں کے واقعی مطالعے کا نعم البدل نہیں۔ کتنی بھی مصروفیت کے ساتھ دیکھا جائے، مالک رام کو چوٹی کے ماہرینِ غالبیات میں جگہ دینی ہو گی۔ یہ مسلّم کہ غالب پر ان کی بعض کتابیں اور مضامین اعلا معیار کے نہیں، لیکن کئی نگارشات بالیقین اس لائق ہیں کہ انھیں غالبیات کے منتخب کاموں میں ایک نمایاں مقام دینا ہو گا۔

اردو میں غالب کی جملہ سوانح عمریوں میں اس وقت "ذکرِ غالب" طبع پنجم سب سے زیادہ جامع اور معتبر ہے، گو اس میں بھی مزید اضافوں اور قدرے ترمیم کی ضرورت ہے۔ ان کے خُرد معتقدین کو صلائے عام ہے۔ "تلامذۂ غالب" اپنے موضوع کی نہ صرف بہترین نمائندہ بلکہ واحد کتاب ہے۔ طبع اوّل کے تبصروں کی روشنی میں دوسرے ایڈیشن کو شاگردوں کا ایک مثالی تذکرہ بنا دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے عام قاری غالب کے پانسات مشہور شاگردوں ہی کو جانتا تھا، یہ کسے معلوم تھا کہ غالب کے ۱۸۲ شاگرد تھے۔ میری محدود معلومات کی حد تک کسی دوسرے استاد شاعر کے شاگردوں پر اس پایے کا یا اس سے سبک تر کام بھی نہیں کیا گیا۔ مالک رام نے غالب پر یہی دو مستقل کتابیں لکھیں اور دونوں اعلا درجے کی ہیں۔

انھوں نے غالب پر معرکے کے متعدد مضامین لکھے۔ "فسانۂ غالب" میں جو تحقیقات پیش کی گئی ہیں، کسی بھی غالب پسند کو ان سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں۔

میں نے دوسرے باب کے آخر میں ان کے پندرہ منتخب مضامین کی فہرست دی ہے۔ان میں سے ذیل کے چھ کو میں گل ہائے سرسبد کہوں گا:

مرزا غالب (خاکہ)۔ میرزا یوسف۔ عبدالصمد، استادِ غالب۔ مقدمۂ پنشن کا عرضی دعوی۔ سکّے کا الزام اور اس کی حقیقت۔ نادر خطوطِ غالب پر ایک نظر۔ تبصرۂ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی۔

"مرزا غالب کا مرقع" اردو میں اپنی طرز کی بے نظیر و بے ہمتا نگارش ہے۔ خاکے کو تاریخی افسانے کے روپ میں پیش کرنا انھیں کی اختراع ہے۔ یہ صرف قلمی تصویر نہیں، ایک طرح سے ان کی سوانح بھی ہے۔ مرزا یوسف کی باقاعدہ سوانح مالک رام ہی نے مرتب کی۔ عبدالصمد کے وجود کو مدلّل طریقوں سے انھیں نے منوایا اور اس کے لیے انھوں نے قاضی عبدالودود جیسے محقق سے لوہا لیا۔ ماہرینِ غالبیات کی اکثریت عبدالصمد کی قائل نظر آتی ہے۔ غالب کے مقدمۂ پنشن کا عرضی دعویٰ انھوں نے لندن میں کھوج نکالا جس سے غالب کی سوانح اور پنشن کے قضیے کے بارے میں خود مستغیث کی زبان سے جملہ تفصیلات سامنے آگئیں۔

سکّے کی حقیقت پر مالک رام کا مضمون "معارف" فروری ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ اگر مالک رام یہ مضمون ایک صدی پہلے ۱۸۵۹ء میں لکھ دیتے تو غالب ان کی پرستش کرنے لگتے۔ غالب ۱۸۵۹ء کے نصفِ دوم میں کاسۂ گدائی لیے اپنے تمام دوستوں سے فریاد کرتے ہیں کہ للہ بیتِ سکہ کے مصنف کا نام تلاش کر دو۔ اسی بدبخت سکّے کی بدولت غالب کی پنشن اور اعزازات سوخت ہو گئے تھے۔ لعنت ہو گوری شنکر جاسوس پر کہ وہ ادبی، تحقیق کے طریقِ کار سے واقف نہ تھا اور شعر کا غلط انتساب کر گیا۔ وا حسرتا کہ اس دور میں کوئی مالک رام جیسا محقق دستیاب نہ تھا۔ رسا:٦ مدانی کی دست کاری بلکہ کلاکاریٔ "نادر خطوطِ غالب" کی قلعی کھولنا بھی مالک رام کی اہم تفصیحی تحقیق مانی جائے گی۔ نسخۂ عرشی کے تبصرے میں انھوں نے عرشی صاحب کی کئی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا لیکن خود چند غلط فہمیوں پر ڈٹے رہے۔ ان کی درستی عرشی صاحب نے کی۔ "کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے"۔ غرض یہ کہ مالک رام کے

مضامین میں جو بیش بہا معلومات بکھری پڑی ہیں، وہ کسی کتاب سے کم عیار نہیں۔

تدوین میں دیوانِ غالب اعلا پایے کا کام نہیں، گو یہ بھی ہے کہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی سامنے نہ آجاتا تو ہم لوگ مالک رام کے ایڈیشن ہی کی قدر کرتے۔ ایک لکیر کے نیچے اس سے بڑی لکیر کھینچ دی جائے تو پہلی لکیر خود بخود چھوٹی ہو جاتی ہے۔ مہیش پرشاد کے "خطوطِ غالب" میں انھوں نے جو اضافے اور تصحیحات کیں، ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس میں بہتری کی مزید گنجائش تھی۔ واضح ہو کہ مالک رام نے قابلیات کے اپنے کام اس حالت میں کیے ہیں جب ان کا ایک پاؤں ملک میں تو دوسرا بیرونِ ملک میں ہوتا تھا بلکہ زیادہ تر ممالکِ غیر ہی میں ہوتے تھے جہاں نہ کوئی کتب خانہ میسّر تھا، نہ تبادلۂ خیالات کے لیے کتابوں کے عارف میسّر تھے۔

تدوینِ غالب میں ان کا بہتر کارنامہ "گلِ رعنا" ہے۔ انھیں یہ مخطوط جب ملا تھا تبھی شائع کر دیتے تو ان کی دھوم مچ جاتی لیکن ان کے پاؤں میں تو سنیچر تھا۔ نسخہ ملنے کے بعد ہی وہ پھر ملک سے باہر چلے گئے، لیکن انھوں نے اس بیش بہا مخطوطے کو اشاعت سے پہلے جس وسیع القلبی کے ساتھ عرشی صاحب کو دے دیا، اس کی دوسری نظیر نہیں ملے گی۔ عرشی صاحب نے مالک رام سے بہت پہلے اپنے دیوانِ غالب نسخۂ عرشی میں اسے پیش کر دیا۔ مالک رام کے اس ایثار کی اہمیت کسی نے نہیں پہچانی کسی نے داد نہیں دی۔

مالک رام نے جب اسے مرتب کیا تو اس پر ۵۳ صفحوں کا سیر حاصل مقدمہ لکھا اور ۸۳ صفحوں میں اختلافِ نسخ دیے۔ اس میں شامل فارسی نثروں پر حواشی کا انبار لگا دیا۔ تدوین میں ان کا دوسرا شاہ کار غالب کے فارسی دیوان کی ترتیب تھی جسے انھوں نے نو(۹) خطّی نسخوں اور حیاتِ غالب کے دو مطبوعہ ایڈیشنوں کی مدد سے مرتب کیا تھا۔ افسوس کہ اس کے بیچ کے کچھ اوراق ضائع ہو جانے کی وجہ سے یہ دیوان منظرِ عام پر نہ آسکا۔ غالب کی "سبد چین" جیسی نایاب کتاب کو ترتیبِ نو اور اضافوں کے ساتھ پیش کرنا بھی اہم ادبی خدمت ہے۔ گو اس کے دیباچے میں ترمیم اور اضافوں کی نشان دہی نہ کرنا ایک فروگزاشت ہے۔

واضح ہو کہ غالبیات، قلم کار مالک رام کے ۷۰ فی صد ہی کو پیش کرتی ہے۔ ان کی خامہ فرسائی کا میدان بہت متنوع ہے۔ وہ غالب کے علاوہ ابوالکلام آزاد کے بھی عارف ہیں۔ ان کی تدوین کے بہترین اور مثالی کام ابوالکلامیات ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں اضافہ کیجیے "کربل کتھا" جیسے مشکل متن کی تدوین۔ ان پر مستزاد ہے ان کی تذکرہ نگاری جو "تلامذۂ غالب" سے بڑھ کر "تذکرۂ معاصرین" اور "تذکرۂ ماہ و سال" تک پہنچتی ہے۔ آخر الذکر دونوں تذکروں میں خامیاں ہیں۔ اس کے باوجود ان میں جو مفید معلومات مل جاتی ہیں، وہ دوسری جگہ کہاں۔ ان کا ایک میدانِ اختصاص اسلامیات ہے۔ غیر مسلموں میں اس شعبے کا ان جیسا عالم دوسرا کوئی نہیں۔ وہ عرب و عجم کی قدیم تاریخ کے بھی عارف ہیں بالخصوص تاریخ اسلام کے۔

اسی سال کی عمر میں کون تصنیف و تالیف کا کام کرتا ہے۔ مالک رام دسمبر ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ عمر کے نویں دہے میں انھوں نے ذیل کی کتابیں شائع کیں۔ ان میں سے بعض کی تفصیل مجھے عبدالقوی دسنوی کے مضمون "کچھ آج کل کے گوشۂ مالک رام کے بارے میں" ("ہماری زبان" ۱۵، مئی ۱۹۹۳ء) سے معلوم ہوئی۔

تحقیقی مضامین	مکتبۂ جامعہ، دہلی، ۱۹۸۷ء
خطوطِ ابوالکلام آزاد	ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۱۹۹۱ء
تذکرۂ ماہ و سال	مکتبۂ جامعہ، دہلی، ۹۰۔ ۱۹۹۳ء
نثرِ ابوالکلام	ہریانہ اردو اکادمی، ۱۹۹۳ء
حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن	مکتبۂ جامعہ، دہلی، دسمبر ۱۹۹۳ء

یہ ضرور ہے کہ ان کتابوں کا مواد پہلے سے موجود ہوگا لیکن ان کی ترتیب و تہذیب تو بہرحال انھیں دنوں میں کرنی پڑی ہوگی۔

اردو میں یادگاری ارمغانوں کا جو اعلا معیار مالک رام نے قائم کیا ہے، اس کی بدولت وہ اردو کے سب سے ماہر نذر گزار ہو گئے ہیں۔ انھیں اس کے لیے یاد رکھا جائے گا۔ ۲۸ سال کی عمر میں جب ان کی بینائی برائے نام رہ گئی تھی، انھوں نے اپنے مستقل رفیق کار کو "نذرِ مختار" پیش کی۔ مالک رام کی مرتبہ چھ نذروں میں سے تین

کا کچھ نہ کچھ رشتہ غالبیات سے ہے۔ "نذرِ عرشی" ان کے ہم پایہ ماہرِ غالبیات کو دی گئی، "نذرِ ممتاز"، "نقدِ غالب" اور "احوالِ غالب" کے مرتّب کو، اور "نذرِ حمید" اس محترم ہستی کو جس نے غالب اکیڈمی کی تعمیر و تشکیل کی۔

جس شخص نے متواتر ۸۶ سال تک خامہ فرسائی کر کے اردو ادب کی اتنی دور رس خدمت کی، اس کی جس منظم طریقے پر مخالفت اور تنقیص کی گئی، اسے دیکھ کر جی جلتا ہے۔ منفی مضامین میں ایسا ظاہر کیا گیا جیسے مالک رام طفلِ مکتب تھے، جاہلِ مطلق تھے۔ معترضین کو ان کے بارے میں ایک حرفِ خیر کہنے کی توفیق نہ ہوئی۔ میں اس ناخوش گوار موضوع پر مزید لب کشائی نہ کروں گا، زمانہ بہترین منصف ہے۔ مجھے فی الوقت مالک رام کی غالب شناسی ہی سے تعلق ہے۔ میری رائے میں مطالعۂ غالب کے میدان میں ان کی تحقیقات، ان کی اولیات اور ان کے تنوع کا اعتراف نہ کرنا ان کے ساتھ ہی نہیں، مطالعۂ ادب کے ساتھ بھی ناانصافی ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ غالبیات کے ادارے ان کی مناسب قدرشناسی کریں گے۔

غالب اکیڈمی اور غالب انسٹیٹیوٹ کی طرف سے ان کی خدمت میں سب سے بڑا خراجِ عقیدت یہ ہو گا کہ ان کے جملہ مضامین، مخطوطات اور مکاتیب کو مرتّب کرا کے شائع کرا دیں۔ کلیاتِ غالب فارسی کے مسوّدے کا خلا کسی ماہر سے پورا کر کے چھاپ دینا چاہیے۔ نثار احمد فاروقی کے بقول انھوں نے ممدوحینِ غالب کا تذکرہ بھی تیار کیا تھا۔ اگر اس کا مسوّدہ دستیاب ہو تو اسے بھی شائع کرنا چاہیے۔ ان کے اخلاف اور معتقدین کی طرف سے ان کی جناب میں سب سے اچھا ہدیۂ ارادت یہ ہو گا کہ ان کی طرح لگن سے کام کرتے رہیں، اردو ادب کو ابھی کئی مالک راموں کی ضرورت ہے۔

کتابیات

اردو فارسی

الف ۔ مالک رام کی تصانیف :

تحقیقی مضامین		مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، دسمبر ۱۹۸۷ء
تلامذۂ غالب	طبعِ اوّل	ادارۂ تصنیف و تالیف، نکودر، ۱۹۵۸ء
ایضاً	طبعِ اوّل	مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء
ذکرِ غالب		مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، طبعِ پنجم، فروری ۱۹۸۶ء
فسانۂ غالب		مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، فروری ۱۹۷۷ء
گفتارِ غالب		مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء
وہ صورتیں الٰہی		مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، طبعِ دوم، جولائی ۱۹۷۶ء

ب ۔ مالک رام کی مدوّناتِ غالبیات

خطوطِ غالب	انجمنِ ترقیِ اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء (دراصل ۱۹۶۳ء)
دستنبو	صد سالہ یادگارِ غالب کمیٹی، دہلی، فروری ۱۹۶۹ء
دیوانِ غالب	بعدِ نظرِ ثانی، آزاد کتاب گھر، دہلی، سنہِ طبع ندارد، غالباً طبعِ دوم ہے۔ طبعِ اوّل ۱۹۵۷ء میں آئی
دیوانِ غالب	صد سالہ یادگارِ غالب کمیٹی، دہلی، فروری ۱۹۶۹ء
سبد چین	مکتبۂ جامعہ، دہلی، ۱۹۳۸ء
عیارِ غالب	علمی مجلس، دہلی، فروری ۱۹۶۹ء
گلِ رعنا	علمی مجلس، دہلی، مئی ۱۹۷۰ء
یادگارِ غالب از حالی، مرتبہ مالک رام	مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، اگست ۱۹۷۰ء

ج ۔ تصانیفِ غالب کے ایڈیشن:

خلیق انجم ڈاکٹر (مرتب)، غالب کے خطوط، غالب انسٹیٹیوٹ، نئی دہلی، جلدِ اوّل، ۱۹۸۴ء
خلیق انجم ڈاکٹر (مرتب)، غالب کے خطوط، غالب انسٹیٹیوٹ، نئی دہلی جلدِ دوم، ۱۹۸۷ء
رضا، کالی داس گپتا (مرتب)، دیوانِ غالب، چوتھا ایڈیشن، نظامی پریس، کان پور
عکسی ایڈیشن بمبئی، ۱۹۸۷ء
رضا، کالی داس گپتا (مرتب)، دیوانِ غالب کامل تاریخی ترتیب سے، ساکار پبلشرز
بمبئی، ۱۵ فروری ۱۹۸۸ء
عرشی، امتیاز علی خاں (مرتب)، دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، انجمنِ ترقیِ اردو ہند، علی گڑھ
طبعِ اوّل، ۱۹۵۸ء
عرشی، امتیاز علی خاں (مرتب)، مکاتیبِ غالب، رام پور، طبعِ اوّل، ۱۹۳۷ء
غالب، دیوانِ غالب چوتھا ایڈیشن، مطبعِ نظامی کان پور، ۱۸۶۲ء، مخزونہ جموں یونیورسٹی
مہر، مولانا غلام رسول (مرتب)، خطوطِ غالب، بارِ دوم، سنہ ندارد، کتاب منزل
کشمیری بازار لاہور (ظاہراً طبعِ اوّل ۱۹۵۲ء و طبعِ سوم ۱۹۶۲ء کے بیچ)
مہیش پرشاد (مرتب)، خطوطِ غالب پہلی جلد، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد، ۱۹۴۱ء

د ۔ دوسری کتابیں:

اعظمی ایم اے، شاہد (مرتب)، اردو تحقیق اور مالک رام، ادارۂ تحقیق، دہلی، ۷۶-۱۹۷۵ء
بھٹاچاریہ، شانتی رنجن، بنگال میں اردو زبان اور ادب چند تحقیقی مضامین، لکھنؤ
۱۹۸۲ء، پرتھوی چندر، مرقعِ غالب، دہلی، ۱۹۸۶ء
حالی، یادگارِ غالب، غالب انسٹیٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء (طبعِ اوّل ۱۸۹۷ء کا عکس)
خالدی، ابوالنصر محمد، تقویمِ ہجری و عیسوی، انجمنِ ترقیِ اردو ہند، دہلی، ۱۹۳۹ء
رشید حسن خان، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۷۸ء
رضا، کالی داس گپتا، غالب کی بعض تصانیف کے بارے میں، ساکار پبلشرز، بمبئی
دسمبر ۱۹۹۰ء

زیدی، کرنل بشیر حسین (مرتب): مالک رام ایک مطالعہ، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی جولائی ۱۹۸۶ء

سحر، ڈاکٹر ابو محمد: غالبیات اور ہم، تخلیق کار پبلشرز دریا گنج نئی دہلی، ۱۹۹۴ء

فاروقی، نثار احمد: تلاشِ غالب، علمی مجلس، دہلی، مئی ۱۹۶۹ء

کاظم علی خاں: خطوطِ غالب کا تحقیقی مطالعہ، کتاب نگر، لکھنو، ۱۹۸۱ء

گیان چند: ذکر و فکر، الہ آباد، ۱۹۸۰ء

گیان چند: رموزِ غالب، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء

مختار الدین احمد، ڈاکٹر (مرتب): احوالِ غالب، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی طبع دوم، ۱۹۸۶ء

مختار الدین احمد، ڈاکٹر (مرتب): نقدِ غالب، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، جون ۱۹۵۶ء

معین الرحمان، ڈاکٹر سید: غالب کا علمی سرمایہ، یونیورسل بکس، اردو بازار، لاہور فروری ۱۹۸۹ء

نارنگ، ڈاکٹر گوپی چند (مرتب): ارمغانِ مالک (۱) مجلسِ ارمغانِ مالک، نئی دہلی، ۱۹۷۱ء

نجم الغنی: بحر الفصاحت، راجا رام کمار بک ڈپو، لکھنو ۱۹۵۷ء

نقوی، ڈاکٹر حنیف احمد، غالب احوال و آثار، نصرت پبلشرز، لکھنو، ۱۹۹۰ء

ہ۔ رسالوں کے مضامین جو مندرجۂ بالا کتابوں اور مجموعوں میں نہیں آئے:

خلیق انجم، ڈاکٹر: غالب کے دو جعلی شاگرد اور ایک جعلی عریضہ، صحیفۂ لاہور، غالب نمبر حصۂ سوم جولائی ۱۹۶۹ء

دسنوی، عبد القوی: کچھ "آج کل" کے گوشۂ مالک رام کے بارے میں، ہماری زبان ۱۵ مئی ۱۹۹۴ء

رضوی، صمد حسین: غالب کی صحیح تاریخ ولادت، اردو، کراچی، غالب نمبر (۱) ۱۹۶۹ء

نیز "عیارِ غالب"، دہلی، ۱۹۶۹ء

شارق، محمد مشتاق: مالک رام کے نام مکتوب، تحریر، دہلی، اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۷۷ء
عرشی، امتیاز علی خاں: دیوان غالب نسخۂ عرشی، نقوش، نومبر ۱۹۶۳ء
فائق، کلب علی خاں: کچھ تلامذۂ غالب کے بارے میں، اردو، کراچی، غالب نمبر فروری، مارچ
۱۹۶۹ء
کاظم علی خاں: غالب کا قیام لکھنو تحقیق کی روشنی میں، ہماری زبان یکم مارچ ۱۹۸۰ء
مالک رام: تبصرۂ دیوان غالب نسخۂ عرشی، نقوش، نومبر ۱۹۶۳ء
مالک رام: خطوط غالب کی ترتیب نو، ہماری زبان ۸۰ مارچ ۱۹۷۵ء
مسلم ضیائی: غالب کا زائچہ اور تاریخ ولادت، اردو نامہ، کراچی، شمارہ ۲۷، مارچ ۱۹۶۷ء
مشفق خواجہ: غالب اور تلامذۂ غالب تذکرۂ بشیر میں، اردو، کراچی، غالب نمبر جنوری مارچ ۱۹۶۹ء

و۔ ہندی کتاب:

۔ شرما، ڈاکٹر شری رام اور رام نواس شرما (مرتب): غالب کے پتر، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد حصہ اول،
۱۹۸۵ء
شرما، ڈاکٹر شری رام: غالب کے پتر، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، حصہ دوم، ۱۹۶۳ء

ز۔ انگریزی کتاب:

Malik Ram : Mirza Ghalib, National Book Trust of India (Dehli, 2nd edition 1980)

جدول متعلقہ صفحہ ۱۲۲

مکتوب الیہ	نسخہ مہیش پرشاد			نسخہ غلام رسول مہر			نسخہ مالک رام		
	ص	خط	تاریخ	ص	خط	تاریخ	ص	خط	تاریخ
ہرگوپال تفتہ	۱	۱	اگست ۱۸۳۹ء	۱۲۰	۱	مئی ۱۸۳۸ء	۱۱	۱	اگست ۱۸۳۹ء
ایضاً	۲	۲	اگست ۱۸۵۰ء	۱۲۳	۲	اگست ۱۸۵۰ء	۱۲	۲	جولائی ۱۸۵۰ء
ایضاً	۳۲	۳۵	۲۳/اگست ۱۸۵۸ء	۱۵۶	۳۳	۲۳/اگست ۱۸۵۸ء	۶۷	۷۱	۲۳/اگست ۱۸۵۹ء
ایضاً	۹۳	۱۱۰	۱۳/اکتوبر ۱۸۶۳ء	۱۹۸	۱۰۸	۱۳/اکتوبر ۱۸۶۳ء	۸۵	۹۶	۱۳/اکتوبر ۱۸۶۲ء فٹ نوٹ
میر مہدی مجروح	۲۵۴	۱۶	۱۸۵۹ء	۲۸۰	۱۶	۱۸۵۹ء	۳۰۳	۱۶	تاریخ نہیں
ایضاً	۲۸۳	۴۳	دسمبر ۱۸۶۳ء	۲۹۵	۴۳	جولائی ۱۸۶۱ء سے قبل	۳۴۴	۳۵	۱۸۶۱ء
شہاب الدین احمد خاں	۲۹۲	۴	اگست ۱۸۶۱ء	۱۰۸	۱۳	۱۸۶۱ء کا نصف آخر یا ۱۸۶۲ء	۳۳۰	۴	اگست ۱۸۶۱ء
حاتم علی بیگ مہر …	۲۹۵	۱	تاریخ نہیں	۲۱۰	۱	تاریخ نہیں	۳۴۵	۱	اوائل جولائی ۱۸۵۸ء
ایضاً	۳۰۴	۹	ایضاً	۲۱۸	۱۰	اکتوبر ۱۸۵۸ء	۳۵۴	۸	اکتوبر ۱۸۵۸ء
ایضاً	۳۰۸	۱۳	ایضاً	۳۰۸	۱۳	تاریخ نہیں	۳۵۷	۱۳	۱۸۵۸ء
ایضاً	۲۹۸	۴	ایضاً	۲۱۴	۴	ایضاً	۳۶۱	۱۶	۱۸۵۹ء
زین العابدین خاں گلشن	۳۱۸	۲	۱۳/مارچ ۱۸۶۵ء			یہ خط شامل نہیں	۳۶۶	۲	تاریخ نہیں
علاء الدین احمد خاں علائی	۳۶۷	۲۹	تاریخ نہیں	۱۰۲	۵۱	تاریخ نہیں	۳۶۷	۱	۱۸۵۸ء
ایضاً	۳۳۰	۲۰	ایضاً	۷۵	۲۰	جولائی ۱۸۶۲ء سے قبل	۳۸۷	۲۲	۱۸/جولائی ۱۸۶۲ء
ایضاً	۳۳۱	۲۱	جولائی ۱۸۶۲ء	۷۶	۲۱	۸ جولائی ۱۸۶۲ء	۳۹۰	۲۳	۱۹ جولائی ۱۸۶۲ء

ادارۂ یادگار غالب

غالب لائبریری

دوسری چورنگی

ناظم آباد

کراچی۔ ۷۴۶۰۰

غالب شناس مالک رام

ہمارے جن چند محققین نے غالب شناسی کو باقاعدہ ایک فن بنا دیا ہے، اُن میں مالک رام کا نام سرِ فہرست ہے۔ اُنھوں نے مقدار اور معیار دونوں کے اعتبار سے غالب پر اتنا کام کیا ہے کہ اب اس موضوع پر کوئی کام بھی اُن کے حوالے اور اُن کی تحریروں سے استفادے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مالک رام کی غالب شناسی اُردو تحقیق و تنقید کا ایک اہم موضوع ہے اور اس موضوع کا حق ادا کرنے کی ضرورت ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ ہمارے عہد کے ایک بڑے محقق ڈاکٹر گیان چند نے (جو خود بھی غالب شناس ہیں) اس موضوع کو شایانِ التفات سمجھا اور مالک رام کے غالب پر کاموں کے جائزے پر مشتمل زیرِ نظر کتاب لکھی۔ ڈاکٹر صاحب نے غالب سے متعلق مالک رام کی تصنیفات، مرتبات اور مضامین کا بڑی دقتِ نظر سے فرداً فرداً مطالعہ کیا ہے اور صرف خوبیوں ہی کی نہیں، خامیوں کی بھی نشان دہی کی ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب بذاتِ خود تحقیق و تنقید کا ایک عمدہ نمونہ بن گئی ہے۔ اس کتاب کی ایک ضمنی خوبی یہ بھی ہے کہ یہ حیات و متعلقاتِ غالب سے متعلق بعض مفید مباحث کا احاطہ کرتی ہے۔ اس وجہ سے بھی کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی